دُعائے نیم شبی
معین شاہد

دعائے نیم شبی

(افسانے)

معین شاہد

(۱) اس کتاب کی اشاعت میں بہار اُردو اکاڈمی، پٹنہ کا مالی تعاون شامل ہے۔

(۲) کتاب میں شائع مواد سے بہار اُردو اکاڈمی کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔ کسی بھی قابلِ اعتراض مواد کی اشاعت کے لئے خود مصنف ذمّہ دار ہے۔

کتاب کا نام: دُعائے نیم شبی

مصنف کا نام: مُعین شاہد

پہلی بار: ایک ہزار

ماہ اشاعت: جون ۱۹۹۳ء

خوشنویس: قمر نظامی، معروف گنج، گیا

مطبع: لیبل آرٹ پریس، شاہ گنج، محمد پور، پٹنہ ۶

قیمت: تیس روپے

ناشر: مکتبہ آدرش، آبگلہ، بنیاد گنج، گیا

مصنف کا پتہ: آدرش ویکلی، آبگلہ، بنیاد گنج، گیا ۸۲۳۰۰۱

تقسیم کار

بُک امپوریم، سبزی باغ، پٹنہ ۴

مکتبہ آدرش، آبگلہ، بنیاد گنج، گیا

انجمن ترقی اُردو بہار، اُردو بھون، پٹنہ ۴

چھوٹے دادا

حضرت انجم مان پوری مرحوم

کے

نام

فہرست

دُعائے نیم شبی

آج حشمت علی خوشی سے پھولے نہیں سمارہے تھے۔ شہر سے ان کے بیٹے عبداللہ نے ان کو خط لکھا تھا جسے وہ بار بار پڑھ رہے تھے اور ان کے چہرے پر مسرّت کی کئی لہریں آجا رہی تھیں جن کی وجہ سے ان کا گورا چٹا چہرہ لال بھبھوکا ہو رہا تھا ۔۔۔ انہوں نے اندرونِ حویلی آکر زور دار آواز میں اپنی بیگم کو پکارا (جو باورچی خانے میں کھانا پکانے میں مصروف تھیں۔ ” اجی سُنتی ہو، عبداللہ کا خط آیا ہے۔ وہ اپنی تعلیم مکمل کر کے اگلے سوموار کو صبح والی ٹرین سے آرہا ہے۔ “

” کیا لکھا ہے اس نے “۔ بیگم چولہے پر سے سالن کی کڑاہی اُتارتے ہوئے ان کی طرف دوڑیں۔

” اس نے لکھا ہے کہ اس نے انجینئرنگ کا امتحان پاس کر لیا ہے۔ اور ... ... اور ..... “

” اور اور کیا لکھا ہے۔ “

” اللہ بڑا مہربان ہے بیگم۔ اس نے اپنی نوازشوں سے اسے ایک بڑی کمپنی میں ملازمت بھی دلوادی ہے۔ اسے ایک کمپنی کی طرف سے آفر آیا ہے۔ “

بیگم ان کے ہاتھ سے خط لیکر پڑھنے لگیں۔ فرطِ مسرت سے ان کی بانچھیں کھلی جاتی تھیں۔ خط کے الفاظ ان کی نظروں میں گڈمڈ ہونے لگے وہ کبھی خط کو پڑھتیں اور کبھی بوسہ دیتیں۔ جیسے یہ خط، خط نہ ہو بلکہ کوئی آسمانی صحیفہ ہو جس میں ان کے لئے بشارت ہی بشارت ہو۔

حشمت علی کی پوری حویلی میں اس خوش خبری سے شادیانے بجنے لگے، جیسے بارات اُتر آئی ہو۔ وہ جس وقت کے منتظر تھے، وہ وقت آ پہنچا تھا۔ اب ان کا لڑکا انجینئر بن گیا تھا۔ گاؤں میں اس سے قبل کسی کا لڑکا تو انجینئر نہیں بنا تھا۔ اب ان کی عزت و توقیر میں مزید چار چاند لگ جائیں گے۔ فخر سے ان کا سینہ پھول گیا۔ وہ اپنے دالان میں لمبی چوڑی چوکی پر بچھی ہوئی سفید چاندنی پر آ کر بیٹھ گئے۔ آج ان کا تیور ہی کچھ اور تھا۔ شان ہی اور تھی۔ کاش کوئی آ کر ان سے پوچھے کہ آج ان کی یہ کیفیت کیوں ہو رہی ہے۔ آج وہ اس کا اظہار بھی کرنا چاہیں تو نہیں کر سکتے۔

یوں تو حشمت علی گاؤں میں ایک ممتاز حیثیت کے مالک تھے۔ اس گئے گزرے زمانے پر بھی ان کے پاس سینکڑوں بیگہ کی کاشت تھی۔ کھیت کھلیان تھے، گاؤشالہ میں اب بھی کئی گائیں اور بھینسیں تھیں۔ جو کافی دودھ دیتی تھیں۔ کھیتوں میں ہل چلانے کے لئے اچھی نسل کے بیلوں کی کئی جوڑی تھی۔ اس کے علاوہ ٹریکٹر بھی تھا۔ ہاٹ بازار جانے کے لئے دو بیل کھولی کے علاوہ ایک جیپ گاڑی بھی تھی۔ نوکر چاکر کی ایک خاصی پلٹن ان کی حویلی میں پل رہی تھی۔ گھر میں عیش و عشرت کے بھی سامان مہیا تھے۔ لیکن عبداللہ کے انجینئر بننے کی خبر اور ہی تھی۔ اس خبر نے ان کے خاندان کی عزت میں اور اضافہ کر دیا تھا۔ آج ان کی دلی مراد بر آئی تھی۔

سوموار کی صبح میں خط لکھنے کے مطابق عبداللہ آ گیا۔ باپ نے اسے گلے سے لپٹا لیا، ماں نے بلائیں لیں اور ڈھیروں دعائیں دیں۔ بہنیں اپنے بھائی کو دیکھ کر اس پر واری جانے لگیں۔

عبداللہ کے آنے کے بعد ماں نے دوسرے ہی روز اس سے کہا "اب تمہاری شادی ہو جانی چاہیے۔"

باپ نے بھی حامی بھری۔ ہاں ہاں۔ اس فرض سے بھی اب سبکدوش ہو جانا ہی چاہیے۔ تمہاری خالہ بھی آج آنے والی ہیں۔ تمہارا رشتہ تو ان ہی کی بیٹی درخشاں سے

لگا ہوا ہے، تم تو جانتے ہی ہو۔" وہ ایک ہی سانس میں بول گئے۔

"آپ لوگوں نے شادی کا یہ مسئلہ کیوں کھڑا کر دیا۔"

"نہیں بیٹے۔ ماں باپ کی یہ سب سے بڑی خواہش ہوتی ہے کہ ان کے گھر میں چاندسی بہو آئے۔ پھر پوتا پوتی ہو۔ گود میں کھلایا جائے۔" حشمت علی کے لہجے میں ساری تمنائیں اور مرادیں سمٹ آئیں۔ جو باپ بیٹے کے مقدس رشتے کی معراج تھیں۔

وہ خاموش ہو گیا۔ اور اس نے ماں باپ کی خواہشوں کے آگے سپر ڈال دی۔

پھر اس کی شادی اس کی خالہ زاد بہن درخشاں سے ہو گئی اور درخشاں دولہن بن کر حشمت علی کی حویلی میں آ گئی۔ چھ ماہ کے بعد عبداللہ کو شہر کی کمپنی میں بحیثیت انجینئر جوائن کرنا تھا۔ وہ درخشاں سے جدا ہو کر دور شہر چلا گیا۔ درخشاں کی دل نواز یادوں کی شمعیں اس کے دل و دماغ میں روشن رہتیں۔ جن کی تابانی سے ان کے حوصلوں کو نئی قوت اور اس کی محنت کو نئی تازگی حاصل ہوتی۔ اسے وہاں اچھا سا کوارٹر بھی مل گیا تھا۔ اور یہ کوارٹر درخشاں کے بغیر سونا سونا اور اُجاڑ سا معلوم ہوتا۔ لیکن اسے اپنے والدین کی خواہشوں کا احترام تھا۔ اس کے والدین چاہتے تھے کہ ان کی بہو ان کے ساتھ گاؤں ہی میں رہے۔ وہ ہر چھوٹی اور بڑی تعطیل میں گاؤں آ جاتا اور درخشاں کی ہر ممکن دل جوئی کرتا، اسے اپنی بیوی سے بے پناہ محبت ہو گئی تھی۔ درخشاں محبت کرنے کے قابل بھی تھی۔ اس کا حسن سینکڑوں میں ایک تھا۔ گہری صاف و شفاف جھیل کی طرح اس کی نیلی آنکھیں، ان پر سیاہ پلکوں کی خنجر نما ہلکی اور ترچھی دو لکیریں، چوڑی پیشانی بیضاوی چہرہ، چہرے کے جاذب نظر اور پرکشش خدوخال، زلفیں کہ گنگا کی طرح بل کھاتی ہوئی موجیں، سڈول جسم اور جسم کے وہ نقوش ــــ یہ سب اس کے تصور کے نہاں خانے میں کئی ملکوتی رنگ و روپ اُجاگر کرتے۔ جن میں وہ طرح طرح سے اپنے اچھوتے، کومل ازدواجی نقش و نگار اُبھارتا

اور اپنے آپ جھوم جھوم جاتا۔

اسی طرح چار سال گذر گئے۔ اور اب ایک نئی خواہش نے اس کے ماں باپ کو پریشان کرنا شروع کر دیا۔

"کاش جلد پوتا یا پوتی ان کی گود میں ہو۔" اور درخشاں خواہش اولاد سے بے نیاز اپنے شریک حیات کے وجود سے اپنی روح اور ذہن کو طمانیت بخشتی رہتی۔ وہ عبداللہ کو پا کر دونوں جہاں کی خوشیوں سے بے نیاز ہو گئی تھی اس کے لئے عبداللہ سب کچھ تھا۔ لیکن اولاد کا ہونا ایک عورت کے لئے ضروری بھی تو ہے کہ اولاد کی رگِ جان سے محبت کے نئے نئے سرچشمے پھوٹتے ہیں جس سے عورت کے تن و مُو میں ایک نیا حسن اور نیا وقار پیدا ہوتا ہے اور درخشاں اس سے ابھی تک محروم تھی۔

اور جب پانچ سال گذر گئے اور درخشاں کے پاؤں بھاری نہ ہوئے اور دن نہ چڑھا تو حویلی میں طرح طرح کے چرچے ہونے لگے۔ آس پاس کی عورتیں اس کی ساس کے پاس آکر اس کی بے ثمر جوانی کے چکڑ دے لے کر بیٹھ جاتیں۔ کوئی کچھ کہتی کوئی کچھ۔ بھلا کسی کی زبان کو کون روک سکتا ہے اور وہ بھی عورت کی زبان کو عورت لاکھ کسی بات کو سرگوشی کے انداز میں کہے بھی، پھر بھی وہ بات طشت از بام ہو ہی جاتی ہے اور طرفہ تماشا یہ کہ راز کی بات کہنے کے بعد یہ ضرور کہے گی۔" بوا۔ کسی سے نہ کہنا۔ ہم نے کچھ کہا نہیں ہے۔ اللہ معاف کرے۔" پھر وہ راز کی بات اتنی جلدی افشا ہو جاتی ہے کہ وہ راز، راز ہی نہیں رہتا۔ وہ گلی اور آنگن کا قصہ ہو کر رہ جاتا ہے۔ سو ایک روز درخشاں نے اپنے کان سے گھر میں اس کی ساس سے کچھ عورتوں کو کھُسر پھُسر کرتے ہوئے سُن لیا۔" اے بہو تو بانجھ ہے۔ ایک بچہ بھی جنم نہ دے پائی۔"

" اری میری سُنو۔ املی والے شاہ سے دعا، تعویذ کراؤ لو بُو اور منت بھی مانگ لو۔ اللہ ضرور سُنے گا۔ اور پیر بزرگ کے طفیل سے اس کی گود بھر جائے گی۔"

" ہاں ہاں۔ رحیمن ٹھیک کہتی ہے۔ جلوہ کی بیٹی کو دس سال کے بعد اولاد ہوئی۔

اور یہ سب املی والے شاہ صاحب کی کرامت ہی تو تھی۔" سلّو بوا نے حامی بھری۔

اور اُس رات درخشاں کو نیند نہیں آئی۔ وہ رات بھر تکیہ پر سر رکھے روتی رہی۔" بھلا یہ بھی کوئی بات ہوئی۔ اولاد، رزق، حیات و موت تو اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے۔ اس میں وہ کیا کر سکتی ہے۔ بانجھ عورت بھی تو اللہ ہی کی مخلوق ہے۔ سماج کی نظروں کے سامنے بانجھ عورت اتنی حقیر اور ذلیل کیوں کہی جاتی ہے۔" مگر اس کی فریاد کو کون سننے والا تھا۔ بس ساس، سسر، نندیں، خالائیں، پھوپھیاں، حتیٰ کہ گاؤں کی اڑوس پڑوس، ٹولہ بیگہ کی عورتیں اس پر منہ آرہی تھیں۔ انھیں اس کی بانجھ پن کی فکر کھائے جا رہی تھی۔ خواہ مخواہ۔ للہ فی اللہ جیسے انہیں اس سے اللہ واسطے کا بیر ہو گیا ہے۔

اب کے محرم کی تعطیل میں جب عبداللہ گاؤں آیا تو اس کی ماں اور باپ نے یک زبان ہو کر اس سے کہا۔

" بیٹا ہمیں پوتا پوتی کی بڑی آرزو ہے اور اللہ نے تم کو ابھی تک کوئی اولاد نہیں دی ہے۔ سو ہم چاہتے ہیں کہ تمہاری دوسری شادی کر دیں۔ دوسری بہو آئے گی تو شاید تمنا پھلے پھولے۔"

اوٹ میں لگی درخشاں نے یہ بات سُنی تو اس پر بجلی سی گر گئی۔ وہ اپنے اوپر قابو نہ پا سکی۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ ہچکیاں بندھ گئیں اور عبداللہ تو یہ سن کر حواس باختہ ہو گیا۔ اس کے ذہن میں کبھی یہ بات آئی نہیں تھی کہ ایک روز اس کے والدین درخشاں کے لئے سوکن لانے کے لئے کہیں گے۔ اسے درخشاں سے اتنی محبت تھی کہ وہ دوسری عورت کا تصور بھی اپنی زندگی میں گناہ سمجھتا تھا۔ وہ چیخا " آپ لوگ یہ کیا کہہ رہے ہیں۔ مجھ سے یہ نہیں ہو سکتا۔"

حشمت علی نے اسے سمجھاتے ہوئے بولے " بیٹا! آخر یہ جاری نسل کیسے

چلے گی۔ یہ اتنی بڑی حویلی، جائداد، کھیت کا مالک کون بنے گا۔ ذرا سوچو۔۔۔
اس میں حرج ہی کیا ہے۔ دوسری شادی کرنا کوئی گناہ نہیں ہے۔ درخشاں کو ہم چھوڑنے کے لئے تو نہیں کہہ رہے ہیں۔ وہ بھی اس گھر کی مالکن رہے گی۔ ہم تو صرف اولاد کی خاطر دوسری بہو لانے کے لئے کہہ رہے ہیں۔"

کچھ دیر سوچنے کے بعد عبداللہ بولا "میں اپنے ساتھ اب کے درخشاں کو شہر لے جاؤں گا۔ وہاں اچھی سے اچھی لیڈی ڈاکٹر ہیں۔ میں درخشاں کا وہاں علاج کراؤں گا۔ اللہ نے چاہا تو آپ لوگوں کی مرادیں پوری ہو جائیں گی۔ آپ لوگ ایک سال کی تو مہلت دیں۔ تاکہ میں اس کا علاج کرا سکوں۔"

ماں باپ دونوں سوچ میں پڑ گئے۔ بات معقول تھی۔ عبداللہ کی بات مان لی گئی۔ اور وہ درخشاں کو شہر لے آیا۔

شہر میں رہتے دس ماہ گذر گئے۔ اور درخشاں بانجھ کی بانجھ ہی رہی۔ اب میاں بیوی زیادہ متفکر رہنے لگے۔ کیوں کہ سال کو پورا ہونے میں صرف دو ماہ رہ گئے تھے۔ عبداللہ یہ سوچ سوچ کر ہلکان ہو جاتا کہ اگر اللہ نے درخشاں کی گود خالی ہی رکھی تو وہ کیا کرے گا۔ وہ درخشاں کے لئے سوکن کیسے لا سکتا ہے۔ یہ تو اس سے نہ ہو سکے گا۔

ایک روز عبداللہ اسکوٹر پر اپنی بیوی کے ساتھ علی الصباح بڑے اسپتال سے گذر رہا تھا کہ اس نے اسپتال کے پیچھے بڑے نالے کے پاس ایک نوزائیدہ بچے کے رونے کی آواز سنی۔ وہاں پر کوئی نہ تھا۔ بچہ بڑی بے بسی کے عالم میں ہاتھ پاؤں مار رہا تھا۔ درخشاں نے لپک کر اس بچہ کو گود میں اٹھا لیا۔ وہ مامتا کے جذبہ سے مغلوب ہو کر بچہ کو آنچل میں چھپائے ہوئے عبداللہ سے بولی "چلو چلو جلد کو اڑ چلیں۔ نجانے کس کلموہی، مُردار، نگوڑی نے اس بچے کو جنم دیا ہے۔ اور اپنے پاپ کو چھپانے کے لئے اور سماج کے ڈر سے اسے یہاں پھینک آئی ہے۔"

دونوں اپنے کوارٹر میں چلے آئے۔

عبداللہ اور درخشاں اس بچّہ کو پاکر بہت خوش ہوئے اور اسے اللہ کا بھیجا ہوا ایک تحفہ تصور کرنے لگے۔ اللہ کی بھی کیا مرضی ہے کہ ایک عورت اپنی بدنامی، رسوائی اور ذلّت کے خوف سے اپنی کوکھ کا بچّہ پھینک دیتی ہے اور ایک عورت اپنی نیک نامی، سرخروئی اور اپنے خاندان میں عزت کی زندگی گذارنے کے لئے دوسری عورت کے گناہ کو اپنے سر لینے کے لئے مجبور ہو جاتی ہے۔ اب یہ بچّہ درخشاں کا بچّہ کہلائے گا۔ جو بچّہ ایک عورت کے لئے باعثِ صد آزار ٹھہرا وہی درخشاں کے لئے باعثِ افتخار ہوا۔

"اب یہ بچّہ اپنا بچّہ ہے، تمہاری کوکھ کا۔ سمجھی۔ جب ہم گاؤں جائیں گے تو اس بچّہ کو تمہاری گود میں دیکھ کر ابّا اماں کتنے خوش ہوں گے۔ وہ ذرا بھی شک نہ کر پائیں گے کہ اسے تم نے جنم نہیں دیا ہے۔" عبداللہ نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

"میں سب سمجھ گئی۔ ننھا بھی خوب صورت ہے۔ تمہاری طرح۔" درخشاں بچّہ کو اپنی چھاتی سے چمٹاتے ہوئے بولی۔ ممتا کا ایک طوفان اس کے اندر ہچکولے لے رہا تھا۔

عبداللہ نے گاؤں خط لکھ دیا کہ اللہ تعالیٰ نے اسے اولادِ نرینہ سے نوازا ہے۔ وہ تین مہینہ کے بعد درگا پوجا کی تعطیل میں گاؤں آئے گا۔

اور جب عبداللہ کے ساتھ درخشاں بچّہ کو گود میں لے کر شہر سے گاؤں پہنچی تو اس کی گود میں بچّہ دیکھ کر اس کی ساس خوشی سے ناچنے لگی۔ ساس نے اس کی گود سے بچّہ لے لیا۔ آنکھ پھاڑ پھاڑ کر کبھی بچّہ کو دیکھتی اور کبھی دولہن کو۔ جیسے اس کی حویلی میں سچ مچ چاند ہی اُتر آیا ہو۔ حویلی میں خوب خوشیاں منائی گئیں۔

عبداللہ تعطیل ختم ہونے کے بعد ڈیوٹی پر شہر چلا آیا۔

پھر امسال ایسا ہوا کہ اساڑھ، ساون بھادوں میں نہ بادل ہی آئے،

نہ بجلی چمکی اور نہ ہی ایک بوند پانی برسا، آسمان اپنی بے وفائی پر اترا ہوا تھا دن میں دھوپ رہتی اور رات میں تارے چھٹکے رہتے۔ آسن کا مہینہ بھی شروع ہونے کو ایک ہفتہ رہ گیا تھا۔ پورا پچھتر چڑھ گیا تھا۔ کانا اور ہتھیا کی طرف گاؤں والے آس لگائے بیٹھے تھے۔ کھیت سوکھے پڑے تھے۔ دراڑیں سی پڑ گئی تھیں دھیان کی ہری موری کب کی پیلی ہو کر سوکھ گئی تھی۔ لوگ پانی کے ایک قطرہ کے لئے بیاکل تھے۔

گاؤں میں ایک فقیر، درویش کا گذر ہوا۔ اس نے گاؤں کی جو یہ حالت دیکھی تو اس نے گاؤں والوں سے کہا کہ گاؤں کی بانجھ عورتیں اگر آدھی رات کو اپنے پیدا کرنے والے سے پانی کی دعا کریں تو یہ پیاسی دھرتی جل تھل ہو سکتی ہے۔ وہ بڑی قدرت والا ہے۔" فقیر درویش یہ کہہ کر پورب کی طرف، جہاں پہاڑیوں کا ایک سلسلہ چلا گیا تھا، روپوش ہو گیا۔

گاؤں میں یوں تو بہت ساری عورتیں بانجھ تھیں جو اولاد کی تمنا میں جی رہی تھیں۔ لیکن کوئی عورت اپنے کو "بانجھ" کہلوانے کی روادار نہ تھی جیسے بانجھ کوئی بہت بڑی گالی ہو۔ کسی بھی بانجھ عورت کو کہا جاتا کہ تم آدھی رات کو دعا کرو کہ یہ ایک فقیر کی صدا ہے تو وہ خفا ہو جاتی۔ "تمہاری ہی گھر والیاں بانجھ ہوں میں کیا بانجھ ہوں۔ میں کیوں بانجھ ہونے لگی۔ میری عمر تو اولاد ہونے کی ہے۔" کوئی عورت اپنے اوپر "بانجھ پن" کا لیبل چپکانے کے لئے تیار نہ تھی۔

دلخشاں کی حویلی پر بھی خشک سالی کا بہت بڑا اثر پڑ رہا تھا۔ کھیت ویران پڑے تھے اور مویشیوں کے لئے چارہ تک نہ تھا۔ گاؤں کے تمام لوگوں کی پریشانی اس سے دیکھی نہیں جا رہی تھی۔

ایک رات جب حویلی کے سارے لوگ محوِ خواب تھے اور گاؤں میں گیدڑ اور کتوں کے رونے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ سناٹا اور خوف کا تسلط تھا۔ وہ نصف

شب میں اپنے مالک حقیقی کے سامنے سربسجود ہو گئی اور دعائیں مانگنے لگی۔

اے اللہ تو سمیع و بصیر ہے، سب کچھ جانتا ہے میں تجھے اس معصوم بچہ کا واسطہ دیتی ہوں، جو میری گود میں پل رہا ہے۔ جسے میں نے گود لے کر کسی عورت کی عیب پوشی بھی کی ہے اور تو ستار العیوب ہے۔ عیب پوشی کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔ تو ہمارے گاؤں پر پانی برسا دے۔ یہاں کی مخلوق بغیر بارش کے مر رہی ہے۔"

اس کی آنکھوں سے جھر جھر آنسو رواں تھے۔ وہ گریہ وزاری کے ساتھ آنچل پسار کر دعائیں مانگ رہی تھی۔

"مجھے گاؤں والیاں ایک بانجھ عورت سمجھ کر ٹھکرا رہی تھیں اور میرے لئے سوکن لانا چاہتی تھیں۔ لیکن تو نے سوکن کے جلاپے کے اس عذاب سے مجھے بچا لیا۔ اے اللہ اس بانجھ عورت کی لاج رکھ لے۔ ایک بانجھ عورت بانجھ دھرتی کے کرب کو خوب جانتی ہے۔ پانی برسا کر مجھ جیسی بانجھ عورتوں کو اپنے حضور میں سرفرازی عطا کر۔ تاکہ میرا دل کم از کم مطمئن ہو کہ تیرے سامنے بانجھ عورت حقیر نہیں ہوتی۔"

صبح ہوتے ہوئے بادلوں نے آسمان کو گھیر لیا اور ٹوٹ کر اتنا برسا کہ پیاسی دھرتی جل تھل ہو گئی۔

اس بات کو صرف درخشاں جانتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کی دعائیں قبول کیں اور پانی برسایا۔ ورنہ گاؤں والے تو یہی جانتے ہیں کہ درخشاں اب بانجھ نہیں ہے اور وہ فقیر، درویش کی ہدایت پر عمل نہیں کر سکتی۔ لیکن اللہ خوب جانتا ہے کہ درخشاں بانجھ کی بانجھ ہے۔ اور اس کی گود میں پلنے والا بچہ کسی اور کی کوکھ کا بچہ ہے۔

●●

وحشت کا رنگ

آج جب صبح ہیں آج سو کر اُٹھا تو اس کی پلکوں میں اب بھی خوفناک اور بھیانک خوابوں کی کرچیاں چبھ رہی تھیں اور آنکھیں تھیں کہ سُرخ انگاروں کی طرح دہک رہی تھیں اور چہرہ متوحش، ایک بے نام خون آلود اُس جزیرے کی کالی آندھیوں کا غماز تھا جہاں شور تھا، ہنگامہ اور آگ و خون کی بارش تھی، اور وہ ایک سہما ہوا خوفزدہ بے بال و پر پرندۂ بے جان کی طرح، ایک شجر سوختہ کی سال خوردہ سوکھی ٹہنی سے لٹکا ہوا جھول رہا تھا۔ اسے اتنا ضرور ہوش تھا کہ جب نصف شب میں دو بجے نیم غنودگی کے عالم میں اس کی آنکھ کھلی تھی تو اس نے محسوس کیا تھا کہ اسے شدت کی پیاس لگی ہوئی ہے، اس کی زبان اور اس کے ہونٹ سوکھے ہوئے ہیں۔ وہ کم پاور کے بلب کی ہلکی روشنی میں، کمرے میں رکھی ہوئی صراحی سے گلاس میں پانی انڈیل کر پینا چاہتا تھا تو اسے لگا جیسے کوئی اسے دبوچ رہا ہو۔ اس کا آدھا جسم چارپائی کے اندر تھا اور آدھا جسم چارپائی میں لگی ہوئی مچھر دانی سے باہر لٹک رہا تھا۔ صراحی اور اس کے رعشہ زدہ ہاتھوں کے درمیان صرف ایک ہاتھ کا فاصلہ تھا لیکن صراحی تھی کہ اس سے دور ہوتی چلی جا رہی تھی اور پیاس تھی کہ بڑھتی چلی جا رہی تھی۔ جیسے تشنگی اسی کا مقدر ٹھہری ہو۔ وہ بڑی مشکلوں سے اپنے سارے جسم کو چارپائی پر سمیٹ سکا۔ وہ بیوی کو جگانا چاہتا تھا جو اسی کمرے میں بغل والی چارپائی پر، مچھر دانی لگائے اپنے ایک سالہ ننھے بچے کو اپنے سینے سے چمٹائے سوئی ہوئی تھی۔ اس کا سارا جسم نیند میں کانپ رہا تھا۔ اس کے ہونٹ تھرتھرا رہے تھے۔ وہ کچھ بولنا چاہتی تھی لیکن بول نہیں سکتی تھی۔

اس نے سرگوشی کے انداز میں اپنی بیوی کو لب ہلاتے ہوئے سُنا۔

"آج پھر گوریوں اور ان کے بچّوں اور انڈوں کی خیر نہیں۔"

اس نے اپنی بیوی کو جھنجھوڑتے ہوئے آہستہ سے کہا "مالتی! تم نیند میں کیا اول فول بک رہی ہو۔ اُٹھو اٹھو۔"

مالتی نے نیند میں بڑبڑاتے ہوئے جواب دیا۔ "آج پھر بلا آئے گا اور گوریوں کے بچّوں کو اُٹھا کر لے جائے گا۔"

اس کے بعد ہی کمرے کے مچان پر رکھے اخبارات و رسائل کی فائلوں اور کاغذات کے انبار میں گوریوں کے لگائے ہوئے گھونسلوں میں گویا ایک زلزلہ سا آگیا۔ گوریوں کی آوازیں کمرے میں گونجنے لگیں۔ تمام گوریائیں شور مچاتی ہوئی اِدھر اُدھر اُڑنے لگیں اور کمرے کے روشن دانوں، جالیوں، طاقوں اور الماریوں کے اِرد گِرد چکر لگانے لگیں۔ اور تب میری بیوی اچانک چونک کر اُٹھ بیٹھی اور اس نے اپنے سوئے ہوئے بچے کو اپنی باہوں میں زور سے کس لیا۔

اس نے پوچھا۔ کیا ہوا۔ تم اتنی سہمی اور ڈری ہوئی کیوں ہو؟"

"معلوم ہوتا ہے بلا پھر کمرے میں آگیا ہے۔ وہ گوریوں کے بچّوں کو کھا جائے گا۔"

مالتی بہت ہی خوف زدہ لہجے میں بولی۔ ساتھ ہی اس نے بائیں بازو والے کمرے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "نہ جانے شیلا، پپّو اور راجو کمرے میں ہیں یا نہیں۔ ان کی آواز نہیں آتی۔"

"تم کیسی باتیں کرتی ہو۔ وہ سب سو رہے ہیں۔"

اس نے چارپائی پر سے اُٹھ کر تیز پاور والے بلب کو جلانا چاہا۔ تو مالتی نے اسے روکتے ہوئے کہا "تم چارپائی پر سے نہ اُٹھو اور چادر تان کر سوئے رہو۔"

"گرمی کتنی ہے۔ اور تم چادر اوڑھ کر سونے کے لیے کہتی ہو۔ حد ہو گئی۔ اور پھر ہم اس طرح کمرے میں ڈرتے رہیں گے اور یہ جاننے کی کوشش نہیں کریں گے کہ آخر

گوریائیں کیوں اِدھر اُدھر اُڑتی پھر رہی ہیں اور خطرہ کس جانب سے آنے والا ہے تو اس خوف اور ڈر کا سدّ باب کیسے ہو سکے گا۔" اس نے ذرا ہمت کر کے کہا۔

"میں سب کچھ جانتی ہوں۔ اِدھر کئی دنوں سے ایک جنگلی خونخوار بلّا اس کمرے پر حملہ کرنا چاہتا ہے اور گوریاؤں کے گھونسلے میں رکھے ہوئے انڈوں اور بچوں کی تاک میں ہے۔ اگر تم نے اس بلّے کو مار بھگانے کی کوشش کی تو ہو سکتا ہے کہ وہ تم پر، ہم پر، منّی، شیلا، پپّو اور راجو پر حملہ کر دے۔ بلّا بالکل شیر کا بچّہ معلوم ہوتا ہے۔ میں نے اسے کئی بار دیکھا ہے۔ تم چپ چاپ پڑے رہو اور صبح کا انتظار کرو۔ خطرہ مول لینے سے کیا فائدہ۔" مالتی ڈرتے ڈرتے اور آہستہ آہستہ ایک ہی سانس میں سب کچھ بول گئی۔

"ابھی صبح ہونے میں کافی دیر ہے۔ آدھی رات باقی ہے۔ اس کا تو کچھ علاج کرنا ہی ہوگا۔" اَجے نے گویا اپنے دل ہی دل میں کہا۔

اتنے میں ان دونوں نے مچان پر رکھے اخبارات و رسائل اور کاغذات کے انبار میں کھڑکھڑاہٹ سُنی اور کسی جانور کے مُنہ چلانے کی چپچپاہٹ سُنی تو انہیں یقین ہو گیا کہ بلّا آ گیا ہے۔ اور اسے شکار مل گیا ہے۔ اَجے نے "ہُش ہُش" کی آواز لگائی اور ساتھ ہی اپنے بستر کو زور زور سے تھپتھپایا۔ بلب کی ہلکی روشنی میں اَجے اور مالتی نے دیکھا کہ بلّا اپنے مُنہ میں گوریا کو لئے ہوئے ہے۔ بلّا مچان پر سے مالتی کی نیلون کی مچھردانی پر کودا اور آنِ واحد میں ایک ہی جست لگا کر کمرے کو پار کر گیا۔

اَجے نے اُٹھ کر بجلی کے اونچے پاور کے بلب کو روشن کیا۔ پورے کمرے کا نظام درہم برہم تھا۔ گوریوں کے بال و پر مچھردانی پر بکھرے پڑے تھے اور بلّے کے خون آشام پنجوں کے نشان جا بجا ثبت تھے۔ گوریائیں شور مچا رہی تھیں۔ چوں چوں کی آوازیں کمرے کے در و دیوار سے سر پھوڑ رہی تھیں اور جائے اماں ڈھونڈ رہی تھیں۔ جیسے

بلب کی روشنی ان کی تعزیت کو آئی ہو اور نوحہ کناں ہو۔

مالتی کا دل پہلے سے زیادہ زور سے دھڑک رہا تھا۔

اجے بولا۔ "چلو بلا بھاگ گیا۔ خطرہ ٹل گیا۔ اب ہم سب محفوظ ہیں۔"

مالتی نے تشویش کی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "باہر پڑوسی کے مکان کے صحن اور سائبان میں، منڈیروں اور چھجوں کے نیچے اور شہتیروں سے لٹکے ہوئے ذرا ان گھڑوں کو، لکڑی کے ان ڈربوں کو تو دیکھو جہاں کبوتروں نے بسیرا لے لیا ہے۔ شاید وہاں بھی کوئی دوسرا بلا۔"

"تم تو خواہ مخواہ فکر کر رہی ہو۔ اپنے کمرے کی فکر کرو اور زیادہ جان نہ گھلاؤ۔" اجے نے اسے تسلی دی۔

"بغل والے پڑوسی کا صحن اور سائبان ہمارے کمرے سے زیادہ دور نہیں جہاں کبوتروں کے انڈے اور بچے ہیں۔ ہمیں ان سے کتنا پیار ہے۔ وہ خاکی رنگ کا جوڑا کتنا پیارا ہے، جو ہمارے کمرے کے سامنے کھلی چھت پر آکر غٹر غوں غٹر غوں کرتا ہوا ایک دوسرے کو پیار کرتا ہے۔"

"تم ٹھیک کہتی ہو۔ مجھے بھی ان کبوتروں سے کافی پیار ہے۔ یہ کبوتر نجانے کس جنگل، دلیش سے آکر اس مکان میں بس گئے ہیں۔ یہ پیارے پیارے کبوتر بھی تو ہماری طرح جیوت ہیں۔ انہیں جب کبھی ہم دانہ دیتے ہیں تو وہ کس طرح ہمارے چاروں طرف دیوانہ وار منڈلاتے ہیں۔"

"اسی لئے تو جب اس وقت آفت آئی ہوئی ہے ہمیں ان کی بھی فکر لاحق ہو گئی ہے۔ نجانے کب، کس وقت کوئی بلا آکر انہیں اٹھا کر لے جائے۔"

"ٹھیک ہے ٹھیک ہے۔ صبح ہو لینے دو۔ پھر سب کی خیریت لوں گا۔ اس وقت اطمینان سے سو رہو۔ بلا بھاگ گیا ہے۔" اجے بولتا ہوا کمرے سے باہر نکلا۔ اس نے ادھر ادھر دیکھا۔ بلا واقعی بھاگ گیا تھا۔ لیکن گوریوں کے خون کا ذائقہ چھوڑ گیا تھا۔

یہ گذشتہ رات کا واقعہ تھا جس کے بعد آج بھیانک خواب دیکھ رہا تھا۔

صبح ہو گئی تھی لیکن آج حسب معمول نہ تو گوریّوں کی چہچہاہٹ نے اسے بیدار کیا اور نہ ہی کبوتروں کی غٹرغوں نے اسے صبح کی آمد کی اطلاع دی۔ وہ جب صبح میں اٹھا تو سب سے پہلے اس نے بغل والے مکان کی طرف دیکھا۔ جہاں کبوتروں نے بسیرا لے رکھا تھا۔ گھروں کے سروں پر اور منڈیروں اور چھجوں پر دو چار کبوتر افسردہ خاطر بیٹھے تھے جیسے وہ اپنے ہمسایہ میں ہونے والے حادثہ کا سوگ منا رہے ہوں۔ اور جب اس نے سیڑھی لگا کر کمرے کے مچان پر چڑھ کر دیکھا تو وہ اپنے آپ پر قابو نہ پا سکا۔ خونخوار بلّے نے گوریا کے کئی بچوں کو ہلاک کر دیا تھا اور ایک بچہ جسے ابھی ٹھیک سے بال و پر بھی نہیں نکل پائے تھے، کتاب کے اس سرورق پر آخری سانسیں لے رہا تھا جس پر ایک فاختہ کی تصویر بنی ہوئی تھی۔ اجے کے منہ سے گویا چیخ نکل گئی۔ "چہ چہ۔ بلّا نے بجانے کتنی گوریاؤں کو اپنی غذا بنا ڈالا ہے۔ اب اسے مارنا ہی ہوگا۔" پھر وہ سیڑھی پر سے اترتے ہوئے بولا۔ "ہم لوگ ان دنوں سب حصار ظلم و ستم میں ہیں۔ بجانے کون اور کب آکر شب خون مارے۔"

مالتی بولی "لیکن آج جب بلّا آئے گا تو ہم لوگ مل کر اس پر ٹوٹ پڑیں گے۔"

اور رات جب آئی تو مالتی اور اجے دونوں نصف شب تک جاگتے رہے اور بائیں بازو والے دوسرے کمرے میں اس انتظار میں بیٹھے رہے کہ دیکھیے بلّا کب آتا ہے دونوں نے اپنے اپنے ہاتھوں میں ڈنڈے سنبھال رکھے تھے اور ان گوریّوں کے دفاع کے لیے مستعد تھے۔

جب ٹھیک شب کے ۲ دو بجے کا عمل ہوا تو گوریا گذشتہ شب کی طرح پھر شور مچانے لگیں اور کمرے کا چکر لگانے لگیں۔

مالتی نے ڈرتے ڈرتے کہا۔ "بلّا آگیا۔"

"ہاں تیار ہو جاؤ۔ میں اونچے پاور کا بلب جلاتا ہوں۔" اجے نے آہستہ سے کہا

اور کمرے میں جب روشنی ہوئی تو ان دونوں نے دیکھا کہ بلا نہیں ہے۔ لیکن کمرے میں خوف وہراس اور وحشت کا وہی عالم ہے۔ تمام گوریا کبھی اپنے گھونسلوں کی طرف جاتی ہیں اور کبھی اُڑ کر کمرے کا طواف، بے چینی کے عالم میں کرتی ہیں۔

اجے اور مالتی کو اطمینان ہو گیا کہ آج بلا نہیں آئے گا لیکن کمرے میں بدستور دہشت کے سائے پھیلے ہوئے تھے اور وحشت کا وہی رنگ تھا۔

●●

اَلّوٗ بھابی

اَلّوٗ بھابھی اپنی بڑی حویلی کی چونا گردانی، صفائی اور سجاوٹ میں لگی ہوئی تھیں۔ حویلی کے لمبے چوڑے محراب نما دالانوں، غلام گردشوں اور صحن سے ملحق اس بڑے کمرے کو خاص طور پر اپنے گرانٹ اور کمیا سے جھاڑ پونچھ کروا رہی تھیں جو کبھی اُن کے سسر سلطان نیاز احمد صاحب مرحوم کی خصوصی نشست گاہ تھی اور جہاں ہر صبح و شام رحیم پورہ کے لوگ ہی صرف نہیں اکٹھا ہوتے بلکہ اس کے قرب و جوار کی بستیوں، بیج ناتھ پور، داہو بیگہ، سید پور، رحمت نگر کے دو دو سو بیگہ جوتنے والے زمین دار، اور بڑے چھوٹے کاشتکار اور چودھری بھی حاضر ہوتے۔ اخبارات پڑھے جاتے، اُن پر تبصرے ہوتے، گپ بازیاں ہوتیں، شطرنج کی بساط بچھتی، حقّہ کا دور چلتا۔ بارہ گاؤں کی پنچایت سلطان نیاز احمد صاحب کی اسی بیٹھک میں ہوتی۔ جس میں چھوٹے بڑے قضیے اور جھگڑے چکائے جاتے۔ یہ بیٹھک گویا لوک عدالت تھی جہاں سبھوں کے مقدمات کے فیصلے ہوتے اور جن فیصلوں کو فریقین بے چون و چرا مان لینے میں اپنی عافیت سمجھتے۔ کیوں کہ سلطان نیاز احمد صاحب مرحوم کا فیصلہ حرفِ آخر سمجھا جاتا تھا۔ اس سے انحراف گویا ایک بڑی آفت کو دعوت دینی تھی۔ اس کی نہ تو کہیں اپیل تھی اور نہ کہیں شنوائی۔ سلطان نیاز احمد صاحب مرحوم اس علاقے کے سب سے بڑے زمین دار اور کاشتکار نہ تھے۔ ان کے پاس صرف سو بیگہ کھیت تھے۔ اس علاقہ میں ان سے بڑے بڑے زمیندار اور کاشت کار اور بھی تھے لیکن سلطان نیاز صاحب مرحوم کی شرافت، وجاہت

ریاست اور ان کا دبدبہ ایسا تھا کہ بڑے بڑے ان کے سامنے جھکتے تھے۔ کیا مجال کہ کوئی اُن کی ڈیوڑھی کے سامنے سے ان کو سلام کیے بغیر اپنا گھوڑا سرپٹ دوڑائے نکل جائے۔ منگلا ہاٹ میں، جو ہر ہفتہ رحیم پورہ سے صرف دو میل کی دُوری پر اُن ہی کی زمین میں لگتا تھا، قرب جوار کے کافی لوگ ٹوٹتے تھے۔ اسی روز سلطان نیاز احمد صاحب مرحوم اپنی کھٹولی پر سوار منگلا ہاٹ جایا کرتے تھے، جہاں ان کی کچہری بھی بنی ہوئی تھی۔ جانوروں کا ہاٹ لگتا تھا۔ اس سے اچھی خاصی تحصیل ہوتی تھی۔ یہی تحصیل گویا ان کی ٹھاٹ باٹ کا سبب تھی۔ ان کی انصاف پسندی اور عدل و مساوات کے سبھی قائل تھے۔ جب تک سلطان نیاز احمد صاحب زندہ رہے، اس وقت تک رحیم پورہ اور بارہ گاواں پنچایت میں محبت، بھائی چارگی، ایکتا کی بنسری بجتی تھی۔ ہر کوئی چین کی نیند سوتا اور آرام کی زندگی بسر کرتا۔ پتہ ہی نہیں چلتا تھا کہ اس علاقہ میں کوئی تھانہ ہے بھی یا نہیں۔

یہ آج سے ۲۵ سال قبل کی بات تھی جب انو بھابھی اس بڑی حویلی میں دُلہن بن کر نہیں آئی تھیں۔ اُنھوں نے اپنے سسر کی وہ فارغ البالی اور امن چین کا دَور دیکھا نہیں تھا۔ اُن کے لیے وہ سب ایک قصہ پارینہ کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ اب تو ان کی ساس شاہ بیگم بھی اس دنیا میں نہیں تھیں جب ان کی شادی سلطان نیاز احمد صاحب مرحوم کے بڑے صاحبزادے کمال بابو سے ہوئی تھی تو اس وقت بڑی حویلی میں صرف ان کی ساس شاہ بیگم تھیں۔ اُن کے سسر نے اپنے بیٹے کے سر سہرا بندھتے ہوئے نہیں دیکھا تھا اور اللہ کا ایسا کرنا ہوا کہ جب ان کی بے بی پیٹ ہی میں تھی۔ اسی وقت ان کی ساس اللہ کو پیاری ہو گئیں۔ اس کو ان کی بدنصیبی ہی کہئے کہ انو بھابی دلہن تو بن گئی تھیں لیکن انہیں نہ تو اپنے سسر اور ساس کا لاڈ پیار ملا اور نہ ہی وہ زیادہ دنوں تک اپنے میاں کے ساتھ سکھ چین کا جیون بتا سکیں۔ بے بی ابھی دو ہی سال کی تھی کہ اُن کا سہاگ اُجڑ گیا، ان کی صندلی اور گوری گوری کلائیاں

بنارسی لال لال چوڑیوں سے محروم ہوگئیں۔ ان کی مانگ کی افشاں دُھل گئی۔
برسات کی وہ بھیانک اور منحوس رات تھی، جب بجلیاں زور زور سے چمک رہی
تھیں اور بادل ان کی بڑی حویلی پر تمام قیامت سامانیوں کے ساتھ گرج رہا
تھا کہ اُن کے سرتاج کمال بابو پر قلب کا ایسا شدید دورہ پڑا کہ وہ کروٹ بھی
بدل نہیں سکے۔ انو بھابی سے نہ جانے قدرت کون سا انتقام لینا چاہتی تھی اور
اُنھیں کون سے امتحان میں ڈالنا چاہتی تھی کہ دیکھتے دیکھتے اُن کا بسا بسایا گھر اس
طرح اجڑ گیا کہ در و دیوار سے حسرت برستی تھی اور ماتم کرنے کو جی چاہتا تھا۔
اُن کی آنکھوں کے وہ چراغ بجھ گئے تھے جو کبھی کسی جوان و تندرست باہنوں،
کپکپاتے ہوئے ہونٹوں، چوڑے چکلے سینے اور اونچی پیشانی کے لمس سے جل اُٹھتے تھے۔
جب وہ اپنے میکے سے رخصت ہو کر اپنی سسرال رحیم پورہ آئی تھیں اور اُن
کا ڈولا بڑی حویلی میں اُترا تھا تو گاؤں کی بڑی بوڑھیاں، خالائیں، پھوپھیوں،
رشتہ کی بھاوجیں ان کو دیکھ کر بلائیں لیتے وقت اپنی اپنی انگلیاں اپنے گالوں
پر توڑے بغیر نہیں رہ پاتی تھیں۔ انوری خانم کا حُسن، ان کی مخروطی انگلیاں،
ان کی شربتی آنکھوں پر دراز پلکوں کا جھالر، اُن کا گورا گورا مکھڑا، مکھڑے کا
عکس جمیل۔ ایسا معلوم پڑتا تھا کہ آنگن میں چاند اُتر آیا ہو۔ جس نے دیکھا مبہوت
ہو کر رہ گیا۔ وہ لاکھوں میں ایک تھیں ـــــ اب یہی سراپا کمال بابو کے مرنے کے
بعد گویا موم بتی کی طرح سفید ہو کر رہ گیا تھا۔ جو اندر ہی اندر جل جل کر گھلتی رہتی
ہے۔ وہ سفید ساڑی میں ملبوس، بیوگی کا لبادہ پہنے کوہ قاف کی ایسی پری
معلوم ہوتی تھیں، جو بہت ہی بلندی سے روئی کے گالوں کی طرح زمین پر اُتر
رہی ہو جسے سہاگ کا لال جوڑا کبھی نصیب نہیں ہوا ہو، اور جو تلاش موہوم میں
اِدھر اُدھر بھٹک رہی ہو اور اسے کوئی گلے لگانے والا نہ ہو۔
انوری خانم اس حویلی میں صرف ایک سال تک رہیں اور اس کے بعد

کمال بابو نے انھیں ایک بار جو پیار سے انو کہا تو وہ اس حویلی میں انّو دلہن بن کر رہ گئیں اور شمشاد نے جو انھیں ایک بار انو بھابھی کے نام سے پکارا تو وہ کمال بابو کے مرنے کے بعد بڑی حویلی میں انو بھابھی ہو کر رہ گئیں۔ اب تو ان کا اصلی نام بھی کسی کو یاد نہ تھا۔ شمشاد کی دنیا میں اب اس کی انّو بھابھی کے سوا اور کوئی نہ تھا۔ انو بھابھی اس کے لئے بہت کچھ تھیں۔ وہ ایک بھابھی بھی تھیں اور ایک ماں بھی۔ اسے اپنی مرحومہ ماں شاہ بیگم تو اچھی طرح یاد تھیں۔ اس نے اپنی ماں کی موت پر جو آنسو بہائے تھے، اس کے ایک ایک قطرہ کا حساب اس کی سوجی ہوئی آنکھوں کی پلکیں دے سکتی تھیں لیکن اسے اپنے مرحوم والد سلطان نیاز احمد صاحب کا ہیولا ذرا بھی یاد نہ تھا۔ کیوں کہ وہ اس وقت دو سال کا تھا۔ "دو سال" "پالنے" کی عمر کو اس کے باپ کے ہاتھوں کی دی ہوئی لوریوں کو بھلا وہ کیسے یاد رکھ سکتا تھا۔"

جب اس کے بھائی کمال بابو کا انتقال ہوا تھا تو اس نے اپنی انّو بھابھی سے لپٹ کر روتے ہوئے کہا تھا "انو بھابھی! اب میرا اس دنیا میں کون ہے؟"

اس سوال کا جواب وہ کیا دیتیں کیوں کہ اس دنیا میں، ان کا بھی تو اب کوئی نہ تھا۔

وہ کبھی بے بی کو دیکھتیں اور کبھی شمشاد کو۔ ایک طرف ان کو اپنی بیوگی کا غم کھائے جا رہا تھا تو دوسری طرف ان دو ننھے معصوموں کی یتیمی کا سوگ انھیں خون کے آنسو رُلا رہا تھا۔ انھوں نے بڑے صبر سے کام لیا۔ اور بولیں۔ "میں جو ہوں۔ میں تمہاری بھابھی بھی ہوں اور ماں بھی۔"

اور اس روز سے اُنہوں نے ایک ماں کی طرح شمشاد کا غم اپنے ویران اور اُجڑے آنچل میں سمیٹ لیا۔

انّو بھابھی شمشاد کی دیکھ بھال ایک ماں کی طرح کرنے لگیں۔ بڑی حویلی میں

کام کرنے والی ماما ئیں، خادمائیں بہت ساری تھیں، جو گھر کا کام کاج سنبھالے رہتیں۔ سلّو جو اُن کے ایک کمیا کی بہو تھی، وہ صبح سویرے اپنے گھر سے آجاتی۔ جھاڑو دیتی، جھوٹے برتنوں کو مانجھتی اور چولھے میں آگ روشن کر دیتی۔ اس کے بعد وہ بے بی کو گود میں لے کر، بڑی حویلی کے غربی حصّے میں چلی جاتی، جہاں ایک بڑا سا میدان تھا۔ اور جہاں دھان کے بڑے بڑے تین گانج لگے ہوئے تھے اور پیالی سے وہاں پر کی زمینیں اس طرح ڈھکی تھیں جیسے نرم و ملائم قالین بچھا ہو۔ ان پر چلنے میں اور بے بی کو کھلانے میں سلّو کو بڑا مزہ تھا۔ انو بھابھی دو کام اپنے ہاتھ سے ضرور کرتیں۔ ایک تو یہ کہ کھانا خود پکاتیں اور دوسرے یہ کہ شمشاد اور بے بی کے کپڑوں کو دھونے کے بعد سکھاتیں۔ ان پر آئرن دیتیں اور سلیقے سے ان کو بکس میں رکھتیں۔ شمشاد کا داخلہ انھوں نے نزدیک ہی کے ایک اسکول میں کرا دیا تھا۔ جہاں سے وہ اب میٹرک کا امتحان دینے والا تھا۔ اب اس کی عمر گویا سولہ سال ہونے کو آئی تھی۔ بے بی بھی اب خیر سے آٹھ سال کی ہو گئی تھی۔ جسے وہ ایک مشن اسکول کے نرسری درجہ میں پڑھنے کے لئے بھیجتی تھیں۔ بے بی کا اسکول ۸ بجے صبح سے ہوتا تھا۔ اس لئے وہ سب سے پہلے بے بی کا ہاتھ منھ دُھلاتیں، کپڑے تبدیل کرتیں، آنکھوں میں کاجل لگاتیں اور کتابوں کا بستہ اسے تھما دیتیں۔ پھر سلّو اسے اسکول پہنچا دیتی۔ پھر اس کے بعد وہ شمشاد کو اپنے ہاتھوں سے دُھلے ہوئے کپڑے پہناتیں اور جیسے ہی دس بجتا، اسے ایک گراُت کے ساتھ اسکول روانہ کر دیتیں۔ شمشاد کہتا بھی کہ "انو بھابھی! میں خود چلا جاؤں گا۔ رام پتی کو میرے ساتھ بھیجنے کی کیا ضرورت ہے۔"

"نہیں شمو! اسکول ایک میل پر ہے۔ اور سُنا ہے کہ ان دنوں رحمو چاچا کا سانڈھ آس پاس گھومتا رہتا ہے۔ اگر اس نے مار دیا تو ـــــ"

"وہ مجھے کیا مارے گا۔ آپ نہیں دیکھتیں، میں کتنا بڑا ہو گیا ہوں۔ میں جب اسے دیکھوں گا تو بھاگ کر اسکول پہنچ جاؤں گا۔"

اور وہ ایک سہانے خوابوں میں کھو جاتیں۔ "شمّو ٹھیک ہی تو کہتا ہے۔ وہ اب بچّہ تھوڑا ہی ہے۔ اب تو وہ گاؤں سے پڑھ کر شہر، کالج میں جائے گا۔ میں اسے ضرور میڈیکل پڑھاؤں گی۔ پھر وہ تو ڈاکٹر بن جائے گا۔ پھر اس کی شادی کروں گی۔ چاند سی دُلہن آئے گی۔"

یہ سوچتے سوچتے ان کا دل انجانے خوف سے دھڑکنے لگتا۔ جیسے اندر سے کوئی بد روح اور خوفناک پیکر اُبھر رہا ہو اور کہہ رہا ہو۔ "یہ سب مت سوچو انّو بھابی۔ تم بھی تو چاند سی دُلہن بن کر اس حویلی میں آئی تھیں۔ تم نے بھی تو سہانے خواب دیکھے تھے کہ یہ بڑی حویلی ماضی کی پرانی روایات اور تہذیبی قدروں کی حفاظت کرے گی۔ سلطان نیاز احمد صاحب مرحوم کا بیٹھکہ پھر آباد ہو جائے گا۔ اسی طرح گاؤں کے چھوٹے بڑے جھگڑے طے کیے جائیں گے۔ حقّہ کا دور چلتا رہے گا۔ کھیت اور کھلیان آباد ہوں گے اور وہ ایک سے اکیس ہو جائے گی۔ اس کے شوہر کا آدرمان اس قرب و جوار میں اسی طرح ہوگا جس طرح اس کے سسر کا ہوتا تھا۔

لیکن ان سہانے خوابوں کا تاج محل کس طرح تاراج ہوا۔ مت سوچو۔ خواب خواب ہیں، حقیقت نہیں۔ ان خوابوں نے اب تک کس کا ساتھ دیا ہے۔ جو تمہارا دیں گے۔ انّو بھابی مت سوچو۔"

پھر انّو بھابی کچھ بھی نہیں سوچتیں۔ ان کے پاس سوچنے کے لیے کچھ بھی نہیں رہ جاتا۔ ان کے ذہن کا کشکول مفلس فقیر کے کشکول کی طرح یادوں سے خالی ہو جاتا وہ سوچنا چاہتی تھیں لیکن سوچ نہیں سکتی تھیں۔ وہ کچھ دیر کے لیے سُندر سپنوں کی چادر اوڑھے سونا چاہتی تھیں لیکن اس خوف سے ان سپنوں کی چادر تار تار ہو جاتی تھی کہ مبادا کہیں ماضی کا عذاب ان سے چمٹ نہ جائے۔

جب ان کے شوہر کا انتقال ہوا تھا تو چار پانچ مہینے کے بعد ہی ان کے میکے والوں نے انھیں اس بات پر اُکسانا شروع کر دیا تھا کہ وہ دوسری شادی کر لیں۔

ابھی ان کی عمر ہی کیا ہے۔ لیکن جب بھی کوئی ان سے کہتا "انّو بھابی آپ دوسری شادی کیوں نہیں کر لیتیں۔" تو وہ بپھر کر کہتیں۔ "ایسی بات زبان سے نہ نکالو۔ میری ڈولی تو اب مرنے کے بعد ہی اس حویلی سے نکلے گی۔ اور پھر۔ پھر شمّو کس کو انو بھابی کہہ سکے گا۔ اور اسے کون ماں کا پیار دے گی۔ میرے تو دو دو لعل ہیں۔ شمّو اور بے بی۔ میں تو دونوں کی ماں ہوں۔ میں دوسری شادی کر کے ان کے اس مقدس رشتے کو ختم نہیں کر سکتی ——— اور پھر اس بڑی حویلی میں روزانہ اپنا دکھڑا سنانے یہ غریب لوگ کس کے پاس جائیں گے۔ میں تنہا نہیں ہوں۔ رحیم پورہ کی عورتیں میری ساسیں، میری مائیں، میری بہنیں، میری نندیں، میری بھاوجیں، میری خالائیں ہیں۔ یہ میرے لئے سب کچھ ہیں، یہ میرا پورا پریوار ہے۔ میں اس پریوار کو چھوڑ نہیں سکتی۔"

اور یہ بات صحیح بھی تھی۔ کمال بابو کے مرنے کے بعد سلطان نیاز صاحب مرحوم کے بیٹھکا میں جو لوگ آیا کرتے تھے اب ان کی عورتیں انو بھابی کے پاس آیا کرتیں۔ اُن سے صلاح و مشورہ کرتیں۔ غریب و بیکس لڑکیوں کے رشتے انو بھابی طے کرتیں۔ اور خود اپنے ہاتھوں سے ان لڑکیوں کو دُلہن بنا کر ان کی سسرال رخصت کرتیں۔ وہ ہر سال اپنے پلّو سے کافی روپے خرچ کرتیں۔ جب کاتک میں دھان اور پھاگن چیت میں گیہوں کی کٹائی ہوتی اور کھیتوں کی فصلیں بوجھا بن بن کر ان کی بڑی حویلی کے کھلیان میں آ جاتیں تو اس کی ایک چوتھائی رقم اس مد پر خرچ کرتیں۔ غریب اور بے سہارا اپنے ہریجن کسانوں کی بچیوں کی شادیوں اور اُن کے دکھ درد میں اپنا روپیہ خرچ کر کے انوؔ بھابی کو بڑی مسرت ہوتی، بڑا سکون حاصل ہوتا۔ شاید ان ہی غریبوں کی دعاؤں کا اثر تھا کہ انو بھابی کی وہ دیرینہ خواہش پوری ہو رہی تھی جو انھوں نے شمّو کو میڈیکل پڑھانے کے لئے کبھی ظاہر کی تھی۔ اور جس کے لئے تمنّا کی تھی۔

اور آج شمّو میڈیکل کا فائینل امتحان دے کر شہر سے گاؤں آ رہا تھا اور

انّو بھابی اپنی بڑی حویلی کی چونا گردانی، صفائی اور سجاوٹ میں لگی ہوئی تھیں۔

سید پور کی چودھرائن نے جب بڑی حویلی میں یہ اہتمام دیکھا تو انھوں نے انو بھابی سے پوچھا۔

" آج کیا کوئی مہمان آنے والا ہے، جو اتنی صفائی ہو رہی ہے ؟ "

" ہاں۔ شمّو آ رہا ہے نا۔ اس نے میڈیکل کا امتحان دے دیا ہے رکمنی دیوی "۔ انّو بھابی کا انگ انگ فرطِ انبساط سے ناچ رہا تھا۔ اور ان کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو چھلکے پڑتے تھے۔

" وہ آج آئے گا۔ اب کے دو سال کے بعد آ رہا ہے۔ میرا لعل ڈاکٹر بن جائے گا۔ میں نے اس کا رشتہ گنگا کے دیار کے کنارے آباد نیر پور میں لگایا ہے نا۔ اب تو اس کی شادی ہو گی اور اس کی دلہن آئے گی۔ "

پھر انھوں نے اپنے تصور کے نہاں خانے میں اُتر کر آہستہ سے کہا۔

" کیا اب زندگی بھر اپنے ہاتھوں سے کھانا پکاتی رہوں گی۔ بے بی بھی تو اب جوان ہو گئی ہے۔ کچھ روز کے بعد وہ بھی سسرال چلی جائے گی۔ تو میں اکیلی اتنی بڑی حویلی میں کیسے رہ سکوں گی۔ "

" ہاں، ٹھیک کہتی ہو انو بھابی۔ اب شمّو کی کنیا لے ہی آؤ۔ "

" ہاں رکمنی دیوی ! میں نے سب باتیں طے کر دی ہیں۔ صرف شمّو کے آنے کی دیر ہے۔ شام ہو چلی ہے۔ اب وہ آ ہی رہا ہو گا۔ "

اور شام ہو گئی۔ شمّو بس سے اُتر کر سیدھے اپنی انو بھابی کے پاس حویلی کے اندر پہنچ گیا۔ جہاں انّو بھابی اپنے مہمان کے سواگت کے لئے طرح طرح کے پروگرام بنا رہی تھیں۔ وہ شمّو کو دیکھ کر خوشی کے مارے بے حال ہو گئیں۔ وہ کس طرح اپنے شمّو کا استقبال کریں۔ ان کے بے داغ چہرے پر کیفیت کا عجب عالم تھا۔ انھوں نے پہلے ایک نظر میں اسے جی بھر کر دیکھا اور فرطِ مسرت سے چیخ پڑیں۔

"شمو تم آ گئے۔ ارے اب تو ماشاء اللہ ہم سے بھی دو بالشت اونچے دکھائی دیتے ہو۔ بس بس یہی میں نے اپنے شمو کا جو نقشہ ذہن میں اُتارا تھا، ٹھیک وہی ہے۔ بے بی کے ابا مرحوم کی طرح وہی ناک، وہی نقشہ، وہی آنکھیں، وہی چہرہ، وہی ڈیل ڈول۔"

انو بھابی کے ذہن میں ایک لمحہ کے لیے غیر ارادی طور پر اُن کے مرحوم شوہر کا سراپا گھوم گیا۔ لیکن ماں کا وہ رشتہ لازوال جو انھوں نے اپنے شوہر کے مرنے کے بعد اپنے دیور شمو سے استوار کیا تھا اور جسے اپنی تمام فطری خواہشوں کے ناگ کو مار کر اب تک بچا کر رکھا تھا، فوراً ہی غالب آ گیا۔

"بے بی کے ابا تمہارے بارے میں یہی کہا کرتے تھے کہ شمشاد ٹھیک ابا مرحوم کے نقشے پر ہے۔"

"انو بھابی! آپ کا میں قرض کس طرح چکا سکتا ہوں جس کا بوجھ میرے کندھے پر ہے۔ آپ نے ایک بھابی کا بھی رول ادا کیا ہے اور ایک ماں کا بھی، اس دوہری شخصیت کو میں کون سا خراج عقیدت پیش کروں۔"

"شمو! ایک قرض ہمارے اوپر اور رہ گیا ہے جس سے میں سبکدوش ہونا چاہتی ہوں۔"

"وہ کیا؟"

"وہ یہ کہ میں تمہیں دولہا دیکھنا چاہتی ہوں۔ میں نے تمہارا رشتہ ایک جگہ پختہ کر دیا ہے۔ زبان دے دی ہے۔ اب تم اپنی دلہن اس بڑی حویلی میں لے آؤ۔" پھر ٹھہر کر بولیں "تم نے ڈاکٹری کا امتحان بھی دے دیا ہے۔ اب دو تین ماہ کے اندر تمہارا ریزلٹ بھی آؤٹ ہو جائے گا۔ چار مہینے کے بعد اب کے عید کے چاند میں تمہاری شادی ہو گی۔"

شمو نے انو بھابی کو جب یہ کہتے سُنا کہ تو وہ ہکا بکا رہ گیا۔ اس کے

وہم وگمان میں بھی یہ بات نہ تھی کہ انو بھابی اتنی جلدی اسے رشتۂ ازدواج میں منسلک کرنا چاہتی ہیں۔ اسے شہر میں جا کر نئی سوسائٹی ملی تھی۔ ماڈرن ماحول سے اس کا واسطہ پڑا تھا۔ اس نے سوچ رکھا تھا کہ وہ کسی ایسی لڑکی سے شادی کرے گا جو میڈیکل میں پڑھتی ہو اور اس نے اپنے لئے ایسی لڑکی کا انتخاب بھی کر لیا تھا۔ سو اچانک اس کی زبان سے بے ساختہ یہ الفاظ نکل پڑے۔ "انو بھابی! آپ نے کیوں اتنی جلدی یہ فیصلہ لے لیا۔ اگر شادی ہی کرنی ہے تو آپ پہلے اپنی شادی کر لیجئے۔ آخر آپ بھی تو ......"

اتنا سُننا تھا کہ انو بھابی کو طیش آ گیا۔ اور اپنے جذبات سے مغلوب ہو کر انھوں نے ایک زوردار تھپڑ شمو کے گال پر رسید کر ڈالی۔

"کم بخت! تجھے شرم نہیں آتی کہ ماں کو شادی کرنے کے لئے کہہ رہا ہے۔ کیا میں نے اپنے اندر کی اس شہ زور عورت کو اسی لیے زہر دے کر سُلا دیا تھا جو کئی بار دوسری شادی کرنے کے لئے میری خواہشِ نفسانی کی آگ کو اپنے آنچل سے ہوا دیتی رہی تھی۔؟"

وہ رونے لگیں ــــ "مجھے شادی ہی کرنی تھی تو میں کب کی ہی شادی کر چکی ہوتی اور میں اس حویلی کو چھوڑ کر دوسرا گھر بسا لیتی۔ میں تجھے ماں کا پیار کیوں دیتی۔ میں تو تجھے اب تک ایک بیٹا ہی سمجھتی رہی۔ کیوں کہ بڑی بھابی ماں کے سمان ہوتی ہے اور میں نے ایک ماں کی طرح تمہیں پالا، پوسا، پڑھایا۔ کیا اسی دن کے لئے کہ تو مجھے صرف بھابی کا درجہ دے کر ماں کے اس مقدس اور بلند تر رشتہ کا اپمان کرے۔ تجھے شرم نہیں آتی۔"

اور انو بھابی روتی ہوئی اپنے کمرہ میں چلی گئیں۔ پھر فوراً ہی وہاں سے نکلیں اور بڑی بے چینی کے عالم میں سکو کو آواز دی اور بولیں، "شمو کہاں گیا جا کر دیکھ۔ اس کا گال سوج گیا ہوگا۔ میں نے ناحق تھپڑ مار دی۔ آخر

بچہ ہے نا! جا کر اُسے بُلا لا۔"

شمو اندر حویلی سے نکل کر سر جھکائے اپنے مرحوم باپ سلطان نیاز احمد صاحب کے بیٹھکے میں آ کر اُس تخت پر بیٹھ گیا تھا جس پر ایک سفید چاندنی بچھی ہوئی تھی اور مسند لگا ہوا تھا۔ اور جسے خود انو بھابی نے شمو کے لئے بچھایا تھا۔ اسے اس وقت اپنی مرحومہ ماں شاہ بیگم یاد آ گئیں اور اس کی آنکھوں میں آنسو اُمڈ پڑے۔ یہ احساس ندامت کے آنسو تھے یا اقبال جُرم کے۔ اسے وہاں پر کوئی دیکھنے والا نہ تھا۔

●●

مقدمہ

رمیش کے گھر میں تو اس کی گھر والی کو آئے ہوئے ۲۵ سال ہو گئے تھے۔ لیکن اب تک اس کے سسر سورگیہ دامودر بابو کی طرف سے دئیے گئے مکان پر اس کا قبضہ نہ ہو سکا تھا اور عدالت میں سالے سے مقدمہ چل رہا تھا۔ سالا اپنے سورگیہ پتا کی طرف سے لکھے ہوئے وثیقہ کو جعلی قرار دینے پر تلا ہوا تھا۔ اور اس بات کا ثبوت فراہم کر رہا تھا کہ اس کے پتا نے اس کے بہنوئی کو یہ مکان لکھا ہی نہیں ہے۔ اس وثیقہ پر جتنی گواہیاں ہوئی ہیں اور دستخط ہوئے ہیں وہ سب فرضی اور نقلی ہیں۔ اس طرح یہ رجسٹری ہی باطل ہے۔ اُدھر رمیش اس بات کے شواہد عدالت میں پیش کر چکا تھا کہ اس کے سسر دامودر بابو کے پاس چار مکانات تھے۔ ان میں سے ایک مکان اس کی شادی کے وقت ہی اس کے سسر نے اس کے نام لکھ دیا تھا اور یہ بات حقیقت بھی تھی۔ دامودر بابو کے مرنے کے بعد سالے کی نیت خراب ہو گئی۔ اس نے اس مکان پر اپنے بہنوئی کو قبضہ ہی صرف نہیں دیا بلکہ فوجداری کے کئی جعلی مقدمات میں رمیش کو ملوث کر دیا۔ اس کا سالا پیسہ اور رسوخ والا تھا۔ اس لئے وہ ہر طرح سے رمیش سے زیادہ مضبوط تھا۔ مکان کا کرایہ بھی اب تک اس کا سالا ہی وصول کر رہا تھا۔

رمیش ایک سرکاری آفس میں معمولی کلرک تھا۔ آمدنی بھی کم تھی اور ذرائع بھی محدود تھے۔ اسی کلرکی کے پیسے میں سارا خرچ چلانا پڑتا تھا۔ لڑکوں کی پڑھائی لکھائی، ان کی خورش پرورش، کپڑا لتا، سارے جھمیلے اسی کلرکی کی قلیل

تنخواہ میں جھیلنے پڑتے تھے۔ مکان کا کرایہ الگ دینا پڑتا تھا۔ ۲۵ سالوں کے اندر اس کا پریوار بھی کافی بڑا ہو گیا تھا۔ چار بیٹے اور دو بیٹیاں تھیں۔ ایک بیٹی کی شادی وہ بڑی مشکلوں سے کر پایا تھا۔ ادھر چھ ماہ سے بڑا بیٹا خیر سے بی اے تک پڑھ کر ایک مڈل اسکول میں ٹیچر ہو گیا تھا۔ ایک بیٹی گھر میں کنوارا بیٹھی تھی جس کی شادی کی فکر ہمیشہ دامن گیر رہتی۔ مقدمہ کے خرچ نے اس کی کمر توڑ دی تھی۔ لیکن چونکہ مقدمہ میں ہر تاریخ کو تھوڑا تھوڑا خرچ ہوتا تھا اس لئے پتہ نہیں چلتا تھا کہ اب تک کتنا خرچ ہو چکا ہے۔ ویسے رمیش نے ایک روز اس مقدمہ میں ہونے والے خرچ کو جوڑا تھا تو ۲۵ سالوں کے اندر اتنا خرچ ہو چکا تھا کہ اگر ان پیسوں کو بچا کر رکھا جاتا تو ایک نیا مکان تو وہ بنوا ہی لیتا۔ لیکن ایک کلرک کے بس کی بات یہ تھوڑی ہی ہے کہ وہ اپنی تنخواہ میں سے اتنا بچا پائے کہ وہ رہنے کے لئے ایک مکان خرید لے یا آفس جانے آنے کے لئے ایک اسکوٹر لے سکے۔ وہ تو اتنے پیسوں میں سہانے خواب بھی نہیں دیکھ سکتا۔ پہلی ہی تاریخ کو اس کے سہانے خوابوں کا تاج محل چور چور ہو جاتا ہے۔ یہ تو "آ بیل مجھ کو مار" والا قصہ ہو گیا تھا کہ اس کے سالا نے مقدمہ میں پھنسا دیا تھا اور وہ مجبوراً مقدمہ لڑ رہا تھا۔ ورنہ مقدمہ لڑنا اور کچہری کی پیروی کرنا اس کے بس کی بات نہ تھی۔ رمیش یہ سوچ کر بھی مقدمہ لڑ رہا تھا کہ اگر وہ مقدمہ جیت گیا تو اس مکان کو بیچنے پر کم از کم ایک لاکھ روپے تو مل ہی جائیں گے۔ مکان اچھا خاصا تھا۔ اور بیچ بازار میں تھا۔ بہت سارے سیٹھ ساہوکار اس مکان پر نظر لگائے تھے کہ کب اس مقدمہ کا فیصلہ ہو اور کب وہ اسے خریدیں۔ بوند بوند سے گھر بھرتا ہے سو باپ بیٹے کی اب تنخواہ کی رقم اس مکان کو حاصل کرنے کے لئے جستہ جستہ مقدمہ میں خرچ ہو رہی تھی اور ایک طرح سے مکان کی شکل میں جمع ہو رہی تھی۔ رمیش اور اس کے گھر والے اس مقدمہ کو جیتنے کے لئے زمانے کی مصیبتیں سہہ رہے تھے اور دکھ درد کا جیون بسر کر رہے تھے۔

وہ دن رمیش اور اس کے گھر والوں کے لئے دیوالی کا دن تھا۔ جب رمیش نے کچہری سے آکر یہ خوش خبری سنائی کہ مقدمہ کا فیصلہ اس کے حق میں ہوا ہے۔ اور اب مکان بلا شرکت غیرے اس کا ہے۔ بڑے بیٹے نے، جو مڈل اسکول میں ماسٹر تھا اس نے جب یہ سُنا تو وہ خوشی سے بولا۔ "اب تو میری موٹر سائیکل خریدا ہی جائے گی۔ اسکول دو میل پر ہے۔ آنے جانے میں ایک تو وقت لگتا ہے اور دوسرے تھک بھی جاتا ہوں۔"

بڑی بیٹی جو اسی روز اپنی سسرال سے اپنے بچوں اور شوہر کے ساتھ آئی تھی، یہ مژدہ جانفزا سن کر اپنے پتا سے بولی۔ "آپ نے جہیز میں شادی کے وقت جو کٹوتی کی تھی، وہ اب پورا کر دیں۔ کم از کم ہاتھوں کے کنگن تو ضرور بن جانا چاہئیں۔"

"اتنا ہی کیوں۔ جہیز کا پورا سامان حسب وعدہ تمہارے پتا نے تو دیا تھا نہیں۔ اُس وقت صرف ہاتھ جوڑ کر اور آئندہ دینے کا وعدہ کر کے اپنی گلو خلاصی کر لی تھی۔ اب تو وقت آگیا ہے۔ سب سامان دینے ہوں گے۔" داماد مچل کر بولا۔

"پرانی باتوں کو آپ بھول جائیں۔" رمیش نے ملتجیانہ اپنے داماد سے کہا۔

"آپ جب ۲۵ سالوں کے بعد اپنے مرنے والے سسر کی طرف سے دیئے گئے مکان کو کورٹ سے حاصل کر سکتے ہیں اور اسے بھول نہیں سکتے تو میں کیوں بھول جاؤں اور جہیز کا سامان چھوڑ دوں۔" داماد نے رمیش کی دُکھتی ہوئی رگ پر گویا اُنگلی رکھ دی۔ "آپ نے بھی تو اپنے سسر سے لیا ہے تو میں اپنے سسر سے کیوں نہ لوں۔"

داماد نے اس وقت ایسی بات کہہ دی کہ مقدمہ جیتنے کی ساری خوشی ہوا ہو گئی۔ بات جھگڑے کی شروع ہو گئی۔ یہ سب باتیں رمیش کی گھر والی چپ چاپ سُن رہی تھی حالانکہ اسے بھی اس وقت بڑی خوشی ہوئی تھی جس وقت رمیش نے مقدمہ جیتنے کی خوشخبری سنائی تھی۔ اس نے اس وقت محسوس کیا تھا کہ وہ صحیح معنوں میں اب

گھروالی ہوگئی ہے۔ یہ گھر تو اس کے پتانے گویا اس کے شوہر کو جہیز میں دیا تھا۔ وہ گھر تو اسی کا ہوا۔ رمیش تو گھر والا تھا نہیں۔ گھر والی تو وہ تھی۔ جو گھر والی ہے اور جو اس گھر کی مالکن ہے اس سے نہ تو بیٹا کوئی بات پوچھ رہا ہے اور نہ داماد — یہ کیسا کلجگ ہے۔

رمیش کی گھروالی کچھ بولنے ہی والی تھی کہ دوسرا لڑکا جو کالج میں پڑھ رہا تھا، بولا۔ "اب تک میں ٹیوشن کر کے اپنے کپڑے سلوا تارہا ہوں۔ ہولی اب آنے والی ہے۔ اب کے تو میرا سوٹ سلنا ہی چاہئے۔ اور ہاں، کالج کی ٹیم ایک ٹور پر بمبئی جارہی ہے۔ اس کا خرچ بھی مجھے ملنا چاہئے اور کتابیں بہت ساری خریدنی ہیں۔" دوسرے لڑکے نے ایک لمبی چوڑی فہرست سُنادی۔

رمیش کی گھروالی، جو چپ تھی اور گم سم بنی سبھوں کی باتیں سن رہی تھی کے جذبات کا بندھ جیسے ٹوٹ گیا۔ وہ چیخی۔ "ابھی تو مقدمہ جیتا گیا ہے۔ ابھی بہت سارے بکھیڑے باقی ہیں۔ اس پر قبضہ ہوگا تب نا۔ کرایہ دار مکان خالی کرے گا تب تو اس کی اچھی قیمت ملے گی۔ تم لوگ کیوں اس طرح بوکھلا گئے ہو۔ مکان میرے باپ کا دیا ہوا ہے۔ میں جو چاہوں گی کروں گی۔"

داماد پھر بیچ میں مخل ہوا۔ ماتاجی! آپ کو جہیز کا باقی سامان دینا ہی ہوگا۔ میں لے کر رہوں گا۔ ورنہ ...." داماد کچھ بدشگونی کے الفاظ زبان سے نکالنا ہی چاہ رہا تھا کہ رمیش اور اس کی گھروالی دونوں بیک زبان بول اُٹھے۔

"کوئی بُری بات زبان سے نہ نکالو۔ ہم سب دے دیں گے، دے دیں گے۔" تب کہیں جاکر داماد کچھ دھیما ہوا۔

رمیش کی گھروالی فکر اور تردد کے اتھاہ سمندر میں ڈوب گئی۔ کیوں کہ وہ جانتی تھی کہ وہ بیس ہزار کی مقروض ہے۔ بڑی بٹیاں کے بیاہ اور گونا کے وقت اس نے جو لالہ گردھاری لال سے سود پر روپے قرض لئے تھے، وہ اب تک

ادا نہیں ہو سکے تھے اور قرض کا سود بڑھتا ہی چلا جا رہا تھا۔ مکان کا کرایہ چھ[6] ماہ سے باقی تھا۔ گدام کا بنیا روزانہ تقاضا کر رہا تھا۔

مکان کا مقدمہ ابھی جیتا گیا تھا اور مکان ابھی فروخت نہیں ہوا تھا کہ زندگی کی تمام ضرورتوں، وسوسوں اور ہنگاموں نے انہیں اپنے حصار میں جکڑ لیا، اور ایک عذاب مسلسل میں مبتلا کر دیا۔ ایک ایک کر کے تمام قرض یاد آئے، ضرورتیں سر اُبھارنے لگیں۔ دبی ہوئی تمنائیں حرف مدعا بن کر معصوم زبانوں پر مچلنے لگیں اور مستقبل کے سپنے ان کی آنکھوں کی نیندیں چُرا کر لے گئے۔

ابھی ان کے سامنے دو[2] زبردست مرحلے تھے۔ ایک تو یہ کہ مکان کو کرایہ دار سے خالی کرایا جائے۔ مکان کے اندرونی حصہ میں ایک بدمعاش قسم کا انسان کرایہ دار تھا اور مکان کے باہر چار دکانیں تھیں، جن کے کرایہ دار بہت پرانے تھے۔ ان سے مکان خالی کرانا آسان نہ تھا۔ اس کے لئے ایک الگ مقدمہ ۲۵ سالوں تک لڑنا پڑے گا اور جب تک کرایہ دار سے مکان خالی نہیں کرایا جائے، کوئی گاہک اس کا زیادہ دام نہیں دے گا۔ اُسی مکان کی منہ مانگی قیمت ملتی ہے جو کرایہ دار سے خالی ہو اور ہر طرح کے جھنجھٹ سے پاک ہو۔ اس مکان کی یہ بدنصیبی تھی کہ اس پر سب ہی کرایہ دار قابض تھے۔ مکان کے گاہک تو آنے لگے تھے۔ لیکن کرایہ دار بھگا دیتے اور ساتھ ہیں دھمکی بھی دیتے کہ مکان کبھی خالی نہ ہو گا۔

دوسرا مرحلہ تھا کنواری بیٹی کی شادی کا۔ رمیش اس کی شادی کے لئے بہت ہی متفکر تھا۔ دو تین سالوں سے اپنے بھائی بندوں کے یہاں دوڑ رہا تھا اور ان کی منت سماجت کر رہا تھا۔ گزشتہ جیٹھ میں رمیش ایک جگہ لڑکا پسند کر کے آیا تھا، لیکن وہ تلک کے ۵ ہزار روپے مانگ رہے تھے اور اتنی بڑی رقم رمیش کے پاس نہیں تھی کہ تلک کے اتنے روپے دے کر اپنی آخری بیٹی کی شادی کر دیتا۔ اب جب کہ پورے سماج میں یہ خبر آگ کی طرح پھیل گئی تھی کہ رمیش نے مکان کا مقدمہ

جیت لیا ہے، تو رشتے بھی آنے لگے تھے۔ رمیش نے جہاں گزشتہ جیٹھ میں لڑکا پسند کیا تھا، ایک روز اس لڑکے کا باپ اس کے پاس آیا اور بولا "رمیش جی! اب تو آپ کے اچھے دن آ گئے۔ اب یہ رشتہ پختہ کر لیں اور ہریلا پور والے پنڈت جی کو بلا کر بتراد کھلوا لیں اور بیاہ کا دن مقرر کر لیں۔"

لڑکا اچھا تھا اور کنبہ بھی اچھا تھا۔ گھر کا سکھی تھا۔ لڑکے نے انجینئرنگ کا کورس مکمل کر لیا تھا۔ رمیش نے سوچا۔ چلو لڑکا معقول ہے۔ گھرانہ اچھا ہے۔ اسے اچھی سروس بھی مل جائے گی۔ سو اس نے کہا "ہاں ہاں، میں ایکدم تیار ہوں۔ تلک کے جو روپے آپ نے اس وقت کہے تھے، دینے کو تیار ہوں۔"

"لیکن، رمیش بابو اب تو اس میں کچھ تبدیلی آ گئی ہے اور وہ آپ کی بھلائی کے لئے ہی ہے۔"

"وہ کیا۔" رمیش نے حیرت و استعجاب سے اپنے ہونے والے سمدھی سے پوچھا۔

"وہ یہ کہ، آپ اپنے داماد کو وہ سسرال والا مکان لکھ دیں۔ جو آپ نے مقدمہ لڑ کر بڑی مشکلوں سے اپنے سالا سے حاصل کیا ہے۔ میں کرایہ دار سے خالی کراؤں گا۔ آپ فکر نہ کریں۔ کرایہ داروں سے مکان خالی کرانا آپ کے بس کی بات ہے بھی نہیں۔"

یہ سنتے ہی رمیش کا سر چکرانے لگا۔ اس نے محسوس کیا کہ وہ مقدمہ جیت کر بھی ہار گیا ہے۔ وہ ابھی تک مکان کا مقدمہ جیتا نہیں ہے۔ بلکہ اب یہ مقدمہ نسل در نسل چلتا رہے گا۔ یہ مقدمہ اس کا داماد لڑے گا۔ پھر اس کا داماد، اور پھر اس کا داماد ـــــ ابھی تو یہ مقدمہ گویا شروع ہوا ہے۔ بھگوان جانے اس کا انت کہاں ہوگا۔؟

●●

اگنی پرکچھا

گوپی جب سیالدہ ایکسپریس سے گیا اسٹیشن پر ۹ بجے شب میں اُترا تو بہ اتفاق کی بات تھی کہ اس کی ملاقات شیام ناتھ سے ہو گئی۔ شیام ناتھ کا کالج بند ہو گیا تھا اور وہ پٹنہ سے آرہا تھا۔ پٹنہ سے آنے والی شام کی گاڑی چونکہ لیٹ تھی اس لئے پٹنہ اور کلکتہ سے آنے والی دونوں گاڑیاں بیک وقت آئیں اور دونوں گاڑیاں اپنے اپنے پلیٹ فارم پر کھڑی تھیں۔ جن پر کچھ مسافر چڑھ رہے تھے اور کچھ مسافر اُتر کر اپنی منزلِ مقصود کی طرف روانہ ہو رہے تھے۔ یہ ریل گاڑیاں بھی غنیمت ہیں کہ منزلوں کی مسافتوں کے ساتھ ساتھ دلوں کی دوریوں اور فاصلوں کو بھی کم کرتی ہیں اور مختلف رنگ و نسل، ذات اور مذہب کے انسانوں کو کسی نہ کسی، کہیں نہ کہیں ایک پلیٹ فارم پر یکجا کر کے انہیں ایک دوسرے سے ملا دیتی ہیں، جوڑ دیتی ہیں۔ ایک گاؤں کے بچھڑے ہوئے دو ساتھیوں کو آج چودہ برسوں کے بعد اسی ریل گاڑی نے ملنے کا موقع فراہم کیا تھا۔ دو گاڑیوں کے مسافروں کی آمد و رفت سے پلیٹ فارم پر کافی بھیڑ تھی۔ لوگ باگ اِدھر اُدھر بھاگ دوڑ رہے تھے۔

شیام ناتھ جب پٹنہ گیا لائن کے پلیٹ فارم نمبر پانچ سے چل کر، ریلوے پُل کی سیڑھیوں کو طے کرتا ہوا، پلیٹ فارم نمبر ایک پر واقع ریلوے مسافر خانہ میں جیسے ہی وارد ہوا کہ کسی نے اُسے پیچھے سے پکارا۔ "بھیا ہوشیا ما —" کون، گوپیا۔" شیام ناتھ نے پلٹ کر دیکھا اور اس کے گلے سے لپٹ گیا۔ دونوں آپس میں بغل گیر ہو گئے اور جب دونوں ایک دوسرے سے جُدا ہوئے تو دونوں کی آنکھوں میں آنسو تھے: اور

دونوں کے ہونٹ کانپ رہے تھے۔ وفور جذبات سے الفاظ ان کے ہونٹوں پر آ کر برف کی ڈلی کی طرح جم گئے۔ لیکن وہ ان کہے الفاظ، جو محتاجِ تکلم تھے، محبت، خلوص اور بھائی چارگی کی بہت ساری کہانیاں کہہ گئے، جنہیں صرف گوپی اور شیام ناتھ ہی سمجھ سکتے تھے۔ دونوں ایک دوسرے کے آمنے سامنے کھڑے تھے۔ دونوں کی مسیں بھینگ چکی تھیں اور جوانی ان کی عمر کی دہلیز پر دستک دے رہی تھی۔ دونوں کی آنکھوں میں جوانی کی کشش، چمک، غرور اور حسن کی تمازت امڈی پڑتی تھی۔ گٹھا ہوا جسم، بھرے بھرے بازو، چوڑا چکلا سینہ، لاٹھی بھر قد۔ کچھ بھی تو ان میں قدرت نے اپنی صناعی کا فرق نہیں چھوڑا تھا۔ صناع قدرت نے ان کا جو پیکر تراشا تھا، وہ یکساں تھا۔ وہی ناک نقشہ، وہی رنگ و روپ، وہی جلال و جمال، وہی روشن اور کشادہ پیشانی، وہی چہرے کے خد و خال، لب و رخسار کی وہی بناوٹ اور وہی مجسمہ، جسے روزِ ازل میں آدم کو تخلیق کرتے وقت بخشا گیا تھا۔ ہاں ان میں اس وقت جو نمایاں فرق نظر آ رہا تھا، وہ رہائش اور لباس کا فرق تھا۔ گوپی نے پیلے رنگ کے تسر کا کرتا پہن رکھا تھا جس پر کئی سلوٹیں پڑی ہوئی تھیں اور جو جگہ جگہ مسک گیا تھا۔ کرتے کے ساتھ اس نے چارخانے کی لنگی پہن رکھی تھی۔ ایک لال گمچھا اس کے مونڈھے پر پڑا ہوا تھا۔ اس کے پاؤں جوتے اور چپل سے بے نیاز تھے۔ اس کی آنکھوں میں سرمے کی سلائیاں پھیری ہوئی تھیں اور اس نے بالوں میں بھر چلو سرسوں کا تیل چپڑ رکھا تھا۔ اس نے بالوں کو بڑی شائستگی کے ساتھ سنوار رکھا تھا۔ جو ریلوے مسافرخانہ کی مرکری کی دودھیا روشنی میں چمک رہے تھے۔ اس کے ایک ہاتھ میں لوہے کا صندوق اور دوسرے ہاتھ میں ایک بڑی سی گٹھری تھی۔ جس پر ایک چھاتا اور ناریل کا جھاڑو بندھا ہوا تھا اور اوپر سے ایک دری لپٹی ہوئی نظر آ رہی تھی۔

شیام ناتھ کو دیکھ کر دور ہی سے یہ اندازہ بخوبی لگایا جا سکتا تھا کہ وہ

کسی اونچی ذات کے زمیندار گھرانے سے تعلق رکھتا ہے۔ اس کے ہاتھ میں ایک فلمی میگزین تھا اور کلائی میں ایک خوب صورت سی گھڑی بندھی ہوئی تھی۔ اس نے بوشرٹ اور پینٹ پہن رکھا تھا۔ شیام ناتھ کے چہرے کا رنگ گوپی سے کچھ صاف تھا جس سے پاؤڈر اور اسنو کی خوشبو آرہی تھی۔ اس کے پاؤں میں فل شو تھا۔

گوپی نے اپنے لال گمچھا سے شیام ناتھ کی آنکھوں کے آنسوؤں کو جذب کرتے ہوئے کہا۔ "شیاما! بابوجی، داداجی، ماتاجی اور وہ۔ وہ چھوٹی سی گڑیا، تمہاری بہن شکنتلا، جسے ہم اپنی گود میں لے کر پیار کرنا چاہتے تھے تو تمہارے پنڈت بابا مجھ سے فوراً چھین لیتے تھے اور کہتے تھے کہ تو شودر ہے، اچھوت ہے، میری بچّی کو ہاتھ نہ لگانا۔ وہ سب کیسے ہیں؟ اب تو شکنتلا سیانی ہوگئی ہوگی۔ اس کا بیاہ بھی ہوگیا ہوگا۔"

پھر اس نے بہت ہی اداس لہجے میں کہا "میرے دل میں تو سبھوں کی یاد آتی رہی ہے۔ ہم تو ترے کھاندان (خاندان) کے کیا ہیں نا شیاما! ترا جوٹھا کھایا ہے نا! ترا جوٹھا میرے لئے پوتر ہے اور میرا پوتر بھوجن بھی ترے لوگن کے لئے اَپوتر ہے۔" اس کے بچپن کا دوست اور پنڈت ہری لال کا بیٹا شیام ناتھ چپ چاپ اس کے سامنے اس طرح کھڑا تھا جیسے وہ کسی عدالت کے کٹہرے میں کوئی مجرم کی طرح کھڑا ہو۔

شیاما نے کہا۔ "گوپیا، تے اِی سب بات بھول جا۔ اب ایک دم بھول جا۔ ایک دم بھول جا۔ اور پھر پھر، تو تو ہمرا یار ہے۔ ترے لئے ہمارے دل میں کبھی بھی ایسا بھاؤ نا نہیں آیا۔ ہمارا سبھاؤ تو بچپن میں ترے ساتھ ایسا نہ تھا۔ تجھے یاد ہے کہ ہم دونوں ایک ہی تھالی میں، جب دھن کٹنی کا وقت آتا تھا، تو کھیت میں کھاتے تھے اور ایک ہی کٹورا میں مودیا ن مائی کے کنوئیں کا

پانی پیتے تھے۔"

"ہاں۔ ہاں۔ خوب یاد ہے۔ اور یہ بھی یاد ہے کہ ایک روز جب پنڈت بابا نے ہمیں ساتھ میں کھاتے دیکھ لیا تھا، تو مجھے انہوں نے کتنا پیٹا تھا۔ ابھی تک میری پیٹھ پر ان کی لاٹھی کے زخموں کے نشانات موجود ہیں۔ اور شیاما! تم کو یاد ہے کہ انہوں نے مجھ کو کیا کہا تھا۔ "نیچ ذات، شُدر، تو نے ہمارے دھرم کو نشٹ کر دیا۔ کم بخت اگر کبھی بھی .... " اور اس کے بعد تو نے بڑی معصومیت سے ایک سوال اپنے پتا جی سے کر دیا تھا۔

"پتا جی! یہ شدر اور نیچ ذات کیا ہوتی ہے۔ گوپیا بھی تو ہمارے ہی طرح لڑکا ہے۔ پھر یہ چھوت چھات کیسا؟" اور تم کو یاد ہے انہوں نے اس پر کیا کہا تھا۔"؟

"اب بس کرو۔ بس کرو۔ کالے وقتوں کے زخموں کو اب زیادہ نہ کریدو۔ مجھے سب یاد ہے۔ یاد ہے۔" شیاما نے اپنا رومال گوپیا کے منہ پر رکھ دیا — پھر بھی گوپیا اپنے جذبات واحساسات کے اس طوفان پر قابو نہ پا سکا، جو اس کے دل و دماغ سے اُٹھ رہا تھا۔

"میرے باوا کے کندھے پر ابھی تک اُس ہل کے جوئے کے گھٹّے موجود ہوں گے۔ جسے وہ روزانہ تمہرے کچہری سے اپنے کندھے پر لادے اور بیلوں کی جوڑی ہنکاتے کھیت پر لے جاتے تھے۔ شیاما! تمرے کچہری کے گماشتہ اور براہل کی وہ لال لال آنکھیں اور گرج دار آوازیں آج بھی مجھے یاد ہیں جن میں ہم لوگن سے نفرت، گھنا اور چھوت چھات کی چنگاریاں دہک رہی ہوتی تھیں۔ جس کی وجہ سے میں دس سال کی عمر میں گاؤں سے بھاگ کر کلکتہ چلا گیا تھا اور آج چودہ برس کے بعد کلکتہ سے آ رہا ہوں۔"

دونوں مسافر خانے میں ایک جگہ بیٹھے تھے۔ رات کے بارہ بج رہے تھے۔

اب ان دونوں کا رات میں کیلاش نگر جانا ممکن نہ تھا۔ جو یہاں سے ۲۵ میل دور پورب میں واقع تھا۔ اب صبح میں ہی دونوں اپنے سفر پر روانہ ہو سکتے تھے۔ اس لئے دونوں نے اسی مسافر خانہ میں رات بسر کرنے کا فیصلہ کیا۔ دونوں بہت خوش تھے۔ کہ ایک مدت کے بعد دونوں ملے تھے۔ گوپیا، جو ٹھیک چودہ برس بعد اپنے گاؤں جا رہا تھا، اس کا انگ انگ خوشی سے ناچ رہا تھا۔ جیسے رام ٹھیک چودہ برس بن باس کاٹ کر اجودھیا لوٹ رہے ہوں۔ لیکن کیا وہ اس راون کو مار سکا ہے جو اس کے بچپن میں کیلاش نگر میں ایک نفرت، چھوت چھات کا عفریت بن کر چھایا ہوا تھا۔ وہ راون آج زندہ ہے یا مر گیا۔؟ اسے معلوم نہ تھا۔ وہ تو آج چودہ برس کے بعد کیلاش نگر جا رہا تھا۔ اور شیاما۔ شیاما تو ہر ہفتہ پٹنہ سے اپنے گھر کیلاش نگر جاتا تھا۔ اس لئے وہ تو آج کے کیلاش نگر کے چپہ چپہ سے واقف تھا۔ سو گوپیا نے شیاما سے پوچھا۔

"شیاما! یہ تو جیت کا مہینہ ہے۔ تیرے آموں کے باغ میں اب کے خوب مانجر آئے ہوں گے۔؟"

"مانجر تو آئے تھے لیکن آندھی اور طوفان چرا کر لے گئے۔"

"اور اس کی سگندھ۔ ارے شیاما۔ تجھ کو یاد ہے کہ ہم لوگ مانجر آنے کے اس موسم میں، جب آموں کے درخت ایک سہاگن کی طرح مانجر کے پھولوں کے گہنے سے لدے ہوتے تھے اس کی سگندھ کتنی اچھی معلوم ہوتی تھی، تو خوب خوب سانس لیتے تھے اور پھیپھڑوں کو پھلا پھلا کر ان خوشبوؤں کو بھر لیتے تھے۔ ان خوشبوؤں کو کوئی چرا نہیں سکتا۔" گوپیا خوابوں کے جزیروں میں کھو گیا اور جیسے خواب ہی خواب میں بڑبڑا رہا ہو۔

"کیا کوئی ان خوشبوؤں کو ہم سے چھین سکتا ہے۔؟"

"نہیں پگلے! تو کیسی باتیں کر رہا ہے۔ بھگوان کی پیدا کی ہوئی ان خوشبوؤں کو

مدھ ماتی ہواؤں کو، ان جھرنوں کو، ان پہاڑوں کے آبشاروں کو، پھولوں کی رنگت کو، اور اس کی کوملتا اور سندرتا کو کون چھین سکتا ہے۔" شیاما نے ہنستے ہوئے کہا جیسے وہ گوپیا کو بے وقوف سمجھ رہا ہو۔

لیکن گوپیا بے وقوف نہیں تھا۔ اس کے من میں جو آگ سلگ رہی تھی وہ اس کا اظہار کرنا چاہتا تھا۔

"تو پھر ہم تم ایک ہیں۔ ایک بھگوان کے بنائے ہوئے ہیں تو پھر ہم سے ہماری انسانی ہمدردی، محبت، پیار اور بھائی چارگی کو کون چھین سکتا ہے۔ جب آموں کے مانجر کے پھولوں کی خوشبو نہیں چھینی جا سکتی تو ہم سے ہماری مانوتا بھی نہیں چھینی جا سکتی۔"

"ارے چودہ برس کے بعد تو، تُو بہت سمجھدار ہو گیا ہے اور بڑی اونچی اونچی باتیں کرنے لگا ہے۔" شیاما نے گوپیا سے کہا۔

پھر اچانک شیاما کو بھوک ستانے لگی تو اس نے کہا کہ "بھوک لگی ہے۔ چلو اسٹیشن سے باہر نکل کر کچھ کھا پی لیں۔ پھر صبح ہی گاؤں میں کھانا ہوگا۔"

گوپیا نے اپنی گٹھڑی کھولتے ہوئے کہا۔ "باہر کیوں جائیں۔ میرے پاس کھانے کی چیزیں ہیں۔ جب میں وہاں سے چلنے لگا تھا تو میری کھولی باڑی میں رہنے والے میرے پارٹنر کی بیوی نے پوریاں اور ترکاریاں دی تھیں۔ وہ سب کی سب بچی ہوئی ہیں۔ کھاؤ نا۔ بہت مزے دار ہے شیاما۔ بچپن کا لطف آ جائے گا۔"

شیاما کھلکھلا کر ہنس پڑا اور اس کی زبان سے رال ٹپکنے لگی۔

"لاؤ۔ لاؤ۔ نکالو۔"

اور دونوں مل کر کھانے لگے۔ گوپیا نے جب ایک لقمہ اپنے ہاتھ سے شیاما کے منہ میں ڈالا تو اس وقت شیاما کو بڑا مزہ آیا۔ پھر گوپیا نے اپنے نام چین کے کٹورے کو دھو کر نل سے پانی پیا اور کٹورا میں پانی بھر کر شیاما کو دیا جسے

وہ ایک ہی سانس میں پی گیا۔

رات ہولے ہولے گزر رہی تھی اور اب دو بج چکے تھے۔ لیکن ان دونوں کو نیند نہیں آرہی تھی۔ دونوں باتوں میں محو تھے۔

گوپیا نے پھر پوچھا "شیاما! کیا اب گاؤں کے بڑے کنوئیں پر "بھوئیں ٹولی" کی عورتیں نہیں جاتیں۔ کیا اب بھی ان کو وہاں سے پانی لینے نہیں دیا۔"

اب اس کی ضرورت ہی نہیں۔ اب تو تمہاری "بھوئیں ٹولی" میں سرکار نے چاپا کل لگا دیا ہے۔ اور تمہیں معلوم ہے کہ اب وہاں سرکار نے تم لوگوں کے لئے مکانات بنوا دیئے ہیں۔ اب تو تمہاری "بھوئیں ٹولی" اور "مسہر بیگہ" کی عورتوں اور مردوں کو اس کنوئیں کی محتاجی نہ رہی۔ جس پر اونچی ذات کے لوگوں نے تم لوگوں کو اچھوت سمجھ کر پانی لینے پر پابندی لگا دی تھی۔"

"اور بڑے مندر کا دروازہ؟"

"بڑے مندر کا دروازہ اب بھی تم لوگوں کے لئے بند ہے۔ لیکن اس میں کوئی حرج نہیں۔ تمہاری ذات کے لوگوں نے پوجا کے لئے الگ ایک چھوٹا سا مندر بنا لیا ہے۔"

"لیکن شیاما! یہ تو بڑے دکھ کی بات ہے۔ ہم ایک دوسرے سے چھوت چھات کے نام پر کٹتے چلے جا رہے ہیں۔ نفرت اور الگ تھلگ رہنے کی نیتی ٹھیک نہیں۔ مندر تو بھگوان کی جگہ ہے اور بھگوان تو سب کے لئے ہے۔ پھر مندر میں جانے سے لوگوں کو یہ کہہ کر روک دیا جائے کہ تم شودر ہو، اچھوت ہو، تو پھر بھگوان کیا کہیں گے۔ یہ تو بھگوان کا اپمان ہے۔"

"پھر تم بہکنے لگے۔ میں کہتا ہوں کہ تم ان باتوں کو مت چھیڑو۔"

"آخر کون سی بات کروں گا۔ گاؤں کی جب بات کرتا ہوں تو پھر یہ سب دکھت باتیں زبان پر آ ہی جاتی ہیں۔"

تھوڑی دیر کے بعد صبح ہو گئی اور پورب میں رام شیلا پہاڑ کی اوٹ سے سورج جھانکنے لگا۔ تو گوپیا نے اپنے تمام سامانوں کو سمیٹا اور دونوں ریلوے مسافر خانے سے نکل کر بس اسٹینڈ کی طرف چل پڑے۔ کیلاش نگر والی بس کھڑی تھی۔ دونوں اس بس پر سوار ہو گئے اور جب کیلاش نگر پہنچے تو سورج ایک بانس اوپر چڑھ گیا تھا۔ "بھوئیں ٹولی" جہاں گوپیا کی جھونپڑی تھی، کا راستہ شیاما کی اونچی حویلی سے ہو کر ہی جاتا تھا۔ سو وہ بھی شیاما کے ساتھ ساتھ پنڈت ہری لال کی بڑی حویلی سے گذرا۔ حویلی کے باہر ہی پنڈت ہری لال کھڑے تھے۔ شیاما اپنے پتا جی کے چرنوں پر جھک گیا اور انہیں چھو کر کھڑا ہو گیا۔ گوپیا بھی اپنے دوست کے پتا جی پنڈت ہری لال کے چرنوں کو چھونے کے لئے جھکا تو تیزی کے ساتھ پنڈت جی نے اپنے پاؤں وہاں پر سے ہٹا لئے۔ اور وہ ان کے چرنوں کو چھونے سے محروم ہو گیا۔ اس کے دل و دماغ کو ایک زبردست جھٹکا لگا۔ اور اسے محسوس ہوا کہ اس کے حساس دل پر کوئی ہتھوڑے برسا رہا ہے۔

اس نے چاہا کہ وہ چیخ چیخ کر شیاما سے کہے۔ "چھوت چھات کا راون زندہ ہے۔ جب تک اس راکشش کو مارا نہیں جائے گا اس وقت تک کیلاش نگر کا کلیان نہیں ہو سکتا۔" لیکن الفاظ اس کے ہونٹوں پر برف کی ڈلی کی طرح جم گئے۔ اور اس کی آنکھوں کے کٹورے آنسوؤں سے لبریز ہو گئے۔

گاؤں میں اسے رہتے صرف دو ہفتہ ہی گذرا تھا کہ برکت چچا نے آکر کہا کہ پنڈت ہری لال کے لڑکے شیاما کی طبیعت بہت زیادہ خراب ہے۔ سنا ہے کہ اسے پیلی کا مرض ہو گیا ہے اور اس کے بدن میں خون نہیں ہے۔ اسے کل ہی پٹنہ کے بڑے اسپتال میں لے جایا گیا ہے۔ ڈاکٹر اس کا آپریشن کرنے والے ہیں۔"

گوپیا یہ سن کر گھبرا گیا۔ وہ فوراً پٹنہ میڈیکل اسپتال چلا آیا۔ اس نے دیکھا کہ اس کا دوست بستر مرگ پر پڑا تھا۔ اس کا چہرہ سیاہ ہو گیا تھا۔ آنکھ

دھنس گئی تھیں اور آنکھوں میں جیسے کسی نے پیلا رنگ گھول دیا ہو۔ شیاما کو خون کی ضرورت تھی۔ شیاما کے خون کا گروپ بلڈ بینک میں دستیاب نہ تھا۔ شیاما کے صرف ایک رشتہ دار، جو اس کا بہنوئی ہوتا تھا، کا خون اس لائق تھا جو شیاما کی رگوں میں پہنچایا جا سکتا تھا۔ لیکن اس نے اپنا خون یہ کہہ کر دینے سے انکار کر دیا کہ اس کی صحت اس لائق نہیں کہ وہ اپنا خون دے سکے۔ گوپیا یہ سب سنتا رہا اور اس نے بڑھ کر ڈاکٹر سے کہا، "ڈاکٹر صاحب دیکھیے میرا خون شاید میرے دوست کے کام آجائے۔" وہاں پر کھڑے پنڈت ہری لال کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ لیکن وہ کچھ بول نہ سکے۔ کیونکہ شیاما موت و حیات کی کش مکش سے دوچار تھا اور اسے خون کی ضرورت تھی۔ "جان بچانا پُن ہے۔" پنڈت جی اتنا ہی بول سکے۔

گوپیا کا خون شیاما کے خون کے گروپ کا نکل آیا۔ ڈاکٹر نے جتنا چاہا اس کی رگوں سے اس کا خون سرنج سے کھینچ لیا۔ گوپیا نے ذرا بھی اُف نہیں کیا۔ وہ تو بہت خوش تھا۔ شاید اس کے خون دینے سے اس کے دوست کی جان بچ جائے۔

ڈاکٹروں نے شیاما کا کامیاب آپریشن کیا۔ اور اس کی جان بچ گئی۔

پندرہ روز کے بعد جب شیاما اسپتال سے کیلاش نگر واپس آیا تو گاؤں والوں کے لئے وہ دن بہت خوشی کا تھا۔ چراغاں کیا گیا۔ مٹھائیاں تقسیم کی گئیں۔ آج بڑے مندر کے دروازے سبھوں کے لئے کھول دئے گئے۔ کیوں کہ چھوت چھات کا راون ہلاک ہو گیا تھا اور دوستی کے اگنی پریکشا میں گوپیا کامیاب ہو گیا تھا۔

●●

بد تمیز

وہ یوں تو بی اے کی طالبہ ہے اور اسے ادب اور آرٹ کے مطالعہ سے فرصت ہی نہیں ملتی۔ لیکن اسے قدرت نے فطری طور پر جو ذہن، دماغ اور دل عطا کیا ہے، وہ نہایت ہی حساس واقع ہوا ہے۔ وہ چھوٹی چھوٹی سی باتوں پر گہرائی سے توجہ دینے لگتی ہے اور غور و فکر میں ڈوب جاتی ہے۔ اس کے مزاج کا تقاضہ بن گیا ہے۔ اس مادی دنیا میں رونما ہونے والے واقعات اس کی روح کو پگھلا کر رکھ دیتے ہیں۔ اس کی پیشانی کی لکیریں اور اس کے کومل چہرے کا تموّج اس بات کے غماز ہیں کہ وہ سنگینیٔ حالات سے آنکھیں نہیں موڑ سکتی، وہ کرے تو کیا کرے۔ اپنی طبیعت سے مجبور ہے۔ اسے تو نفسیات، سائنس یا فلسفہ کی طالبہ ہونا چاہئے تھا۔ اب آپ ہی بتائیے نا! کہ اس روز شام کو کھڑکی کے سامنے والی سڑک کی نکڑ پر بنئے کی دکان سے آٹا اور تیل خرید کر لے جانے والی لڑکی کو سائیکل والے نے دھکا دے دیا تو کیا ہوا۔ اور اس کے ہاتھ سے آٹا گر کر سڑک پر بکھر گیا اور کڑوا تیل گر کر سڑک کے کنارے مٹی میں جذب ہو گیا تو کون سی قیامت آگئی تھی کہ وہ متفکر ہو گئی۔ اس منظر کو دیکھ کر اس کے دل و دماغ میں ضرور قیامت برپا ہوئی تھی۔ وہ اس معصوم لڑکی کی رونی شکل کو دیکھ کر خود روسی گئی تھی۔ وہ سوچنے لگی تھی کہ شام کا وقت ہے، اس کا باپ بازار سے کما کر کچھ روپے لایا ہوگا۔ اور تب اس کے یہاں چولہے میں آگ سلگائی گئی ہوگی۔ اور اس کی ماں نے اپنی اس بیٹی کو بقایا روپیہ بنئے کو چکا کر ادھار آٹا اور تیل لانے کے لئے کہا ہوگا۔ اب کیا ہوگا؟

اس کے گھر میں اب کھانا کیسے پکے گا۔ اس کی ماں اسے مار مار کر ادھ مُوا کر دے گی۔ اسی خیال سے وہ لڑکی بے تحاشا رو رہی ہے۔ وہ نہ تو سڑک پر سے آٹا اٹھا سکتی ہے اور نہ کڑوا تیل اپنے چلّو میں بھر سکتی ہے۔ اور اب تو وہ کُتّا بھی اس آٹا اور تیل کو چاٹنے لگا ہے۔ جو شاید اسی انتظار میں تھا۔ وہ یہ منظر دیکھ کر اپنے کمرے میں پاگل سی ہو گئی تھی۔ اس کا دل چاہا کہ وہ کمرے سے نکل کر اس لڑکی کے آنسو پونچھ ڈالے اور اسے چپکے سے کچھ روپے تھما دے۔ وہ بے اختیار کمرے سے نکل کر سڑک پر جانا ہی چاہتی تھی کہ معاً اس کے بھیا آفس سے آ گئے اور وہ ٹھٹھک کر رہ گئی۔

ایسی قیامتیں اس پر کئی بار گزر چکی ہیں اور وہ احساسات و تفکرات کی دو دھاری تلوار سے اپنے دل و دماغ کو کئی بار ریت چکی ہے۔

ابھی حال ہی میں پل پر ایک نو عمر لڑکے کے ٹرک حادثہ میں مرنے کی خبر آئی۔ اور یہ بھی اس تک خبر پہنچی کہ وہ لڑکا اسی محلے کا ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد پڑوس سے رونے پیٹنے کی آوازیں آنے لگیں۔ پڑوسن کا اکلوتا بیٹا ٹرک سے کچل کر ہلاک ہو گیا تھا۔ پڑوسن اس کی ذات، برادری اور مذہب کی نہیں تھی۔ لیکن اسے ایسا محسوس ہوا کہ اس کا اپنا بھائی ٹرک سے کچل کر مر گیا ہے۔ وہ کمرہ سے نکل کر بے تحاشا گلی میں پڑوسن کے پاس پہنچ گئی اور اسے پُرسا دینے لگی۔

"شیلا مائی! تم صبر کرو۔ بھگوان کو یہی منظور تھا۔ ہم لوگ تو مجبور ہیں۔"

ہمدردی کے دو بول سن کر شیلا مائی اپنے بالوں کو نوچنے لگی اور دو ہتھڑ سے سینہ پیٹنے لگی۔ اس سے یہ قیامت خیز منظر دیکھا نہ گیا اور وہ گھر آ کر گھنٹوں رونے لگی۔

اس کا دل ہی ایسا تھا۔ موم جیسا نرم و نازک۔ وہ کسی کا دکھ نہیں دیکھ سکتی تھی۔ صرف دُکھ بٹورنا جانتی تھی۔ اب بھی ایسے لوگ موجود ہیں جن کے دل میں انسانیت کا جذبہ باقی ہے۔ وہ پوری نوعِ انسانی کو اسی انسانیت کے جذبہ، مانوتا کے بھاؤنا سے دیکھتے ہیں۔ وہ دھرم، مذہب اور ذات پاک کی دیواروں کو اس کے بیچ حائل نہیں

کرتے۔ آنسو کسی کی آنکھوں سے ٹپکیں، آنسو ہی ہوتے ہیں۔ ہنسی کا آبشار کسی کے جوئے لب سے پھوٹے، وہ صرف ہنسی ہی ہوتی ہے۔ آہ، ٹیس، غم، جگر سوزی، مسرت، دلوں کی ٹھنڈک، ممتا، پیار، بھائی چارگی، اخوت، محبت۔ یہ تمام چیزیں فطرت کی ایسی قدرتی لازوال عطیہ ہیں جو دنیا کے تمام انسانوں میں بدرجۂ اتم پائی جاتی ہیں۔ انہیں رنگ و نسل اور دھرم نہیں مٹا سکتے۔ سو وہ ان انسانی قدروں کو اچھی طرح جانتی تھی۔ اس کا دل ان باتوں کا خوگر تھا۔ یہی وجہ تھی کہ جب وہ ان انسانی قدروں کو پائمال ہوتے ہوئے دیکھتی تو اس کا دل لہو لہو ہو جاتا۔

اور اب کے۔ اب کے تو ایسا ہوا کہ اس کے گھر میں ایک ایسی عورت وارد ہوئی جس نے اس کی سوچوں کے تمام دروازوں کو مقفل کر کے، صرف ادراک کا ایک دروازہ اپنی طرف کھول کر چھوڑ دیا۔ جس نے اسے دوسروں کے لئے سوچنے کی مہلت ہی نہ دی۔ وہ عورت اس کی نگاہوں کی آماج گاہ اور دیدۂ دل کی مرکز بن کر رہ گئی۔ اس نے اپنی کتاب زندگی کے ان پوشیدہ اوراق کو اس پر وا کر دیئے جن سے وہ اب تک ناآشنا تھی۔ حیات انسانی واقعی ایک کھلی کتاب ہی تو ہے۔ اس کے مطالعہ کے لئے ذوق نگاہ کی شائستگی کی ضرورت ہے۔ اور قدرت نے اسے یہ شائستگئ ذوق نگاہ ودیعت کی تھی۔

اب کے جب اس کی بھابھی کھمّد بن کے چاند یعنی رجب کے مہینے میں اپنے میکے سے اپنی گود میں، اپنے نوزائیدہ بچّے کو لے کر آئیں تو ان کے ساتھ ۲۷ یا ۲۸ سال کی ایک جواں سال عورت بھی آئی۔ وہ عورت جیسے ہی اس کی بھابی کے ساتھ سمٹی سمٹائی، چھوئی موئی سی، دالان میں آئی تو اس نے محسوس کیا کہ یہ عورت ایک وحشت زدہ پرندہ کی طرح سہمی سہمی سی ہے۔ خوف، دہشت، رنج والم نے اس کی آنکھوں میں ڈیرے ڈال رکھے ہیں۔ وہ اپنی زندگی کی خوشیوں اور ناامیدیوں کی

زنجیروں نے اسے جکڑ رکھا ہے۔

"یہ میری سکھی کی چچیری بہن قریشہ ہے۔ وہاں اکیلی رہتی تھی۔ میں ساتھ لے کر آئی ہوں اس کا بھی دل بہلے گا اور کام کاج میں میرا ہاتھ بھی بٹائے گی۔"

پھر بھابی نے اس کی طرف دیکھا۔ "منا کو تو کم از کم گود میں لے گی۔"

قریشہ ہولے سے مسکرائی۔ جیسے کسی نے تالاب کے پرسکون اور ٹھہرے ہوئے پانی میں کنکری پھینک دی ہو۔

اس نے قریشہ کے سراپا کو بغور دیکھا اور وہ اس کی نگاہوں کے اتھاہ سمندر میں ڈوب گئی۔ اور پھر پھر ...... وہ بہت دور، بہت دور، اپنی ذات اور اپنے قیود وہم وگماں سے بھی دور چلی گئی۔ وہ قریشہ کی جیون کہانی گڑھنے لگی۔ اس نے اپنے خیالوں کے آئینہ خانے میں اس کے کئی حسین پیکر تراشے۔ ساوے کی طرح اس کے الجھے سلجھے بالوں کو شانہ کیا۔ اس کی زلفوں کو گوندھ کر چوٹی باندھی، مانگ نکالی۔ مانگ میں پھر سیندور بھرا اور اسے دلہن بنا دیا۔ اس کی عمر تو واقعی دلہن بنے رہنے کی تھی۔ وہ اپنے گاؤں سے اس کی بھابی کے ساتھ کیسے آ گئی؟ اس کا شوہر کیا کہے گا۔ اور اگر اس کا شوہر نہیں ہے اور اس کی شادی نہیں ہوئی ہے تو اس سے بڑھ کر زمانے کی ستم ظریفی اور کیا ہو سکتی ہے۔ اسے یقیناً دلہن بننا چاہئے۔

قریشہ دلہن بنے گی۔ اس نے قریشہ کی گوری گوری کلائیوں میں کامدار، لال رنگ کی چوڑیاں پہنائیں۔ اسے سنوارا سجایا۔ شادی کے شاہانہ جوڑے پہنائے اور جب قریشہ اس کی عروس خیال بن گئی۔ تو اس نے اچانک قریشہ کی طرف دیکھا جو اب بے بی کا پالنا ڈلا رہی تھی اور اپنی زبان میں لوریاں گا رہی تھی۔ اس نے ایسا محسوس کیا کہ ایک ماں کا مقدس جذبہ قریشہ کے دل میں موجزن ہے۔

قریشہ کو اس گھر میں رہتے ہوئے ایک ماہ ہو گیا۔ اس ایک ماہ کے اندر وہ سبھوں سے گھل مل گئی۔ اس گھر میں زیادہ افراد تو نہ تھے۔ اس کا چھوٹا سا خاندان تھا۔

ایک اس کے بڑے بھیّا تھے۔ جو کسی آفس میں اچھے پوسٹ پر تھے۔ ایک چھوٹا بھائی ننھا۔ ایک بھابی تھی اور ایک وہ۔ ماں باپ دونوں پچھلے تین سالوں کے اندر، باری باری سے داغ مفارقت دے چکے تھے۔

قریشہ کے آنے سے سبھوں کو بڑا آرام ملا۔ وہ برتن مانجھنے سے لے کر جھاڑو لگانے تک تمام کام نپٹاتی۔ وہ دن بھر کام کاج میں جٹی رہتی۔ کبھی مُنّے کو اپنے سینے سے لگائے، گود میں لئے ٹہل رہی ہے، کبھی اسے شیشی کا دودھ پلا رہی ہے۔ پھر منّے کو سُلا کر بھابی کے کمرے میں چلی جاتی۔ کمرے کو گیلے کپڑے سے پونچھتی۔ چمکاتی اور تمام سامانوں کو قرینے سے سجا کر رکھ دیتی۔ وہ دولہا بھائی کے گرم کپڑوں کو ایک ایک کر کے برش کرتی، ٹائی کو اپنی جگہ پر لٹکاتی، جوتوں کو صاف کرتی۔ یہ سب کام کرتے کرتے جب وہ قریشہ کو دیکھتی تو وہ محسوس کرتی کہ بھیا کے کمرہ کو صاف کرنے، اور ان کے کپڑوں اور سامانوں کو سلیقے سے سجانے میں قریشہ کو یک گونہ مسرّت حاصل ہوتی ہے۔ وہ جیسے ہی بھیّا کے کمرے میں صفائی کے لئے پہنچتی تو اس نے اسے اس عالم میں بارہا دیکھا تھا کہ اس کی بوٹی بوٹی انجانے خوشی سے تھرک رہی ہے۔ کمرے میں کوئی نہیں ہوتا۔ بھابی باورچی خانے یا غسل خانے میں ہوتیں اور کمرے سے باہر وہ دالان سے اس کی حرکتیں دیکھتی رہتی۔ قریشہ کس لذت ناآشنا سے دوچار ہو رہی تھی۔ وہ کمرے کی تنہائی میں کس سے اکثر و بیشتر باتیں کیا کرتی تھی۔ وہ اچانک کیوں خواہ مخواہ اپنی چوڑیوں کو کھنکھناتی تھی۔ وہ آئینہ میں خود کو دیکھ کر پہلے تو مسکراتی تھی، پھر کیوں اپنے آپ سے شرما جاتی تھی۔ یہ کون سی والہانہ کیفیت تھی۔ بی۔ اے میں پڑھنے والی اور دوسروں کے غم کو ٹٹولنے والی یہ طالبہ نہیں سمجھ سکتی تھی۔

ایک بار اس نے قریشہ کو عجیب حالت میں دیکھا جس کی وجہ سے اس کے

دل میں قریشہ کے خلاف نفرت کا جذبہ پیدا ہو گیا۔ اتوار کا دن تھا۔ بھابی چھوٹے
بھائی کے ساتھ نزدیک کے بازار میں کچھ خریدنے گئی ہوئی تھیں۔ گھر میں وہ تھی۔
قریشہ بھی اور بڑے بھیا تھے۔ اور منا پالنے میں سویا ہوا تھا۔ وہ اپنے کمرے سے
جب نکلی تو اس نے کھڑکی کے پردے سے جھانک کر دیکھا۔ قریشہ اپنے ہاتھوں سے
بھیا کو کوٹ پہنا رہی تھی۔ پھر ان کے جوتوں کے تسمے باندھ رہی تھی اور پھر ان کو
بغور دیکھ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں کے کنول انبساط و شادمانی سے جل اٹھے تھے۔
یہ دیکھ کر اسے قریشہ سے سخت بدگمانی ہو گئی۔ اس کی زبان سے بے ساختہ نکل گیا۔
"اور یہ اب میرے بھیا پر ڈورے ڈال رہی ہے۔ کم بخت، چڑیل۔"
وہ اپنی زبان ہی زبان میں بڑبڑاتے وہاں سے ہٹ گئی۔ "اچھا بھابی کو آنے
دے تو بتاؤں گی۔"

پھر اچانک کمرے میں شور ہوا۔ چپل پھینکنے کی آواز آئی۔ اور رونے اور
چیخنے کی بھی آوازیں آنے لگیں۔ وہ بھیا کے کمرے میں دوڑ کر پہنچ گئی۔ قریشہ ایک
شیرنی کی طرح بپھر رہی تھی۔

"بدتمیز، تمہیں اتنی بھی تمیز نہیں کہ میں تمہاری بیوی کی سکھی کی بہن ہوں۔ یعنی
نند کی خالہ ہوں۔ مجھ پر بری نیت کرتا ہے۔ تم نے میری عزت لوٹنے کی کوشش
کی۔" وہ چپل سے اس کے بھیا کو بے تحاشا پیٹ رہی تھی۔ اور چیخ رہی تھی۔
"تم نہیں جانتے کہ میں سہاگن ہوں، میرا بھی شوہر ہے۔ وہ کہیں دور دیس چلا
گیا ہے۔ وہ آئے گا اور مجھے گونا کرا کے لے جائے گا۔ یہ میرا جسم صرف اسی کے لئے
ہے۔ میں اس جسم کی طہارت اور پاکیزگی کی قسم کھا کر کہتی ہوں کہ میں نے اپنی آبرو کو
زمانے کی ہوس پرستانہ نگاہوں سے بچا کر رکھا ہے۔ میں نے تمہاری پوجا کی۔
اس لئے کہ تمہارے رنگ و روپ میں مجھے اپنے شوہر کا رنگ و روپ نظر آیا۔
میں جب تمہیں دیکھتی تھی تو مجھے میرا شوہر یاد آ جاتا تھا۔ مجھے کیا معلوم کہ اس

رنگ و روپ میں کوئی درندہ چھپا ہوا ہے۔ میں مُنّے کو جب گود میں لیتی ہوں تو میرے سینے میں ممتا کا طوفان موجیں مارنے لگتا ہے۔ کیا مجھے اس بات کا بھی حق نہیں کہ میں سُہانے خواب دیکھ سکوں۔"

پھر وہ اپنے جذبات پر قابو پا کر بولی۔ "تم نے مجھے غلط سمجھا۔ میں ایک بے بس عورت ہو کر صرف اپنے ایک مرد کے لئے اپنی عصمت و عفت کو بچا کر رکھ پائی ہوں۔ افسوس کہ تم جیسے مرد ایک عورت کے لئے، جسے تم اپنی بیوی بناتے ہو، اپنے آپ کو محفوظ نہیں رکھ سکتے۔ اپنے دامن کو داغدار ہونے سے بچا نہیں سکتے۔ اپنی بیاہتا عورت کے رہتے ہوئے معصیت کے کیچڑ میں منہ مارتے پھرتے ہو۔ بدتمیز کہیں کے۔ شرم نہیں آتی۔"

اس روز بی۔ اے کی یہ طالبہ عورت کے ایک نئے کیریکٹر سے روشناس ہوئی اور فریشہ سے اس کی نفرت، محبت و ہمدردی میں بدل گئی۔

●●

حادثہ

آج کے تمام اخبارات میں بس حادثہ کی یہ الم ناک اور افسوس ناک خبر شائع ہوئی ہے جو پڑھنے والوں کو متاثر کئے بغیر نہ رہ سکی :۔

"رام دھن پور کے پُل کی ریلنگ توڑ کر ایک بس ندی میں جا گری جس کے نتیجہ میں اس بس پر سوار ۱۵ مسافر غرق آب ہو گئے۔ صرف ایک مسافر بچ سکا جسے معمولی چوٹیں آئی ہیں اور جو نزدیک کے بڑے اسپتال میں زیر علاج ہے، جس کا نام امیر جان ہے، اور جو یکہ نگر کا رہنے والا ہے۔ سرکار نے مہلوکین کے ورثاء کو دس دس ہزار روپئے دینے کا اعلان کیا ہے۔"

امیر جان کو دیکھنے کے لئے قرب و جوار کے لوگ رام دھن پور کے بڑے اسپتال میں ٹوٹے پڑ رہے ہیں کہ وہ کون خوش قسمت انسان ہے جس کی جان اتنے بڑے حادثے میں بچ گئی۔ بھیڑ پر قابو پانے کے لئے پولس کا ایک دستہ بھی موجود ہے۔ جو لوگوں کو ہٹا رہا ہے۔ لیکن بھیڑ ہے کہ اُمڈی پڑتی ہے۔ امیر جان کو دیکھنے اور اس سے انٹرویو لینے کے لئے ضلع کے اخبار نویسوں اور فوٹو گرافروں کی بھی ایک اچھی خاصی بھیڑ ہے۔ فوٹو گرافران مہلوکین کی تصاویر لینے میں مصروف ہیں جن کی لاشیں ندی سے نکالی جا چکی ہیں۔ ان میں ایک نوجوان عورت کی لاش ہے جس کی مانگ میں سیندور کی لالی اس بات کی گواہی دے رہی ہے کہ وہ نو بیاہتا دلہن ہے اور جو شاید پہلی بار اپنے میکے سے رخصت ہو کر اپنے شوہر کے ساتھ اپنی سسرال جا رہی تھی۔

اس کے صرف ایک ہاتھ میں ایک لال چوڑی ٹوٹنے سے بچ گئی ہے جس سے اس کے کومل ارمان چھوٹی حسرتوں اور تمناؤں کا خون ٹپک رہا ہے۔ ایک چار سال کا بچہ اس کے پاس ہی پڑا ہوا ہے جس کے گلے میں ابھی تک ایک نیپل لٹک رہا ہے۔ اس کے چہرے پر معصوم فرشتوں کا پاکیزہ حسن اور ملکوتی جمال کا پرتو ہے، اور ایسا معلوم پڑتا ہے کہ وہ اب بلک بلک کر رونے لگے گا۔ "امی دودھ دو، دودھ دو۔" لیکن اس کی ماں بھی شاید اس حادثہ کی شکار ہو چکی ہے۔ اب اس کی چھاتیوں سے دودھ کا سرچشمہ کبھی نہیں پھوٹے گا۔ ان لاشوں میں بوڑھے، جوان اور عورتوں کی لاشیں ایک قطار سے ریت پر سجادی گئی ہیں اور موت ان لاشوں پر اس طرح رقصاں، شاداں و فرحاں نظر آتی ہے جیسے کوئی فاتح قوم اپنی مفتوح لاشوں کو جنگ کے میدان میں سجا کر مسرور نظر آتی ہے۔

بڑے اسپتال میں امیر جان ایک بیڈ پر پڑا ہے۔ اسے بہت ہی معمولی چوٹیں آئی ہیں۔ پھر بھی ڈاکٹروں کی ایک پوری ٹیم اس کے علاج و معالجہ میں لگی ہوئی ہے۔ مقامی افسران بھی اسے بڑی تندہی کے ساتھ دیکھ بھال کر رہے ہیں۔

ایک نامہ نگار نے امیر جان کے اس طرح زندہ بچ جانے پر اپنی خوشی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ "آپ واقعی بہت خوش قسمت ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کی جان بخش دی اور آپ موت کے منہ سے نکل آئے۔"

امیر جان نے ایک لمبی سرد آہ بھر کر، اپنے بستر پر کروٹ بدلتے ہوئے کہا۔ "آپ غلط کہتے ہیں۔ میں اس زمانے کا سب سے بدنصیب شخص ہوں کہ اس حادثہ میں میری موت نہیں آئی۔"

وہ جھٹ اپنے بستر پر سے اٹھ کر بیٹھ گیا اور بولا۔ میرا واحد علاج موت ہی ہو سکتی ہے۔ لیکن موت بھی کتنی کٹھور ہے کہ اس نے میری زندگی کا چراغ گل نہیں کیا۔ آج میں مر گیا ہوتا تو میری بیوی کو، جو میری واحد وارث ہے، اسے کم از کم

دس ہزار روپے سرکاری خزانے سے ضرور مل جاتے جن سے وہ اپنی بیٹی کی شادی آسانی سے کر سکتی تھی۔"

سب نامہ نگار دم بخود ہو کر اس کی باتوں کو سُننے لگے۔

ایک دوسرے نامہ نگار نے اس کی باتوں کے سلسلے کو بیچ ہی میں کاٹتے ہوئے کہا۔" زندگی اگر ہے تو آپ امیر جان میاں! ایسے کتنے دس ہزار روپے کما لیں گے۔ زندگی سب سے بڑی نعمت ہے اور پیسہ روپیہ تو ہاتھ کا مَیل ہے۔ جب ہاتھ ہی نہیں رہے گا تو پھر مَیل کہاں۔"

اس نامہ نگار کے ان الفاظ نے جیسے اس کے دل کے تمام زخموں کے ٹانکے ادھیڑ کر رکھ دیئے۔ اس کی خشک اور غمزدہ آنکھیں آنسوؤں سے لبریز ہو گئیں۔ اور اس کی آنکھوں کے اتھاہ سمندر میں درد و کرب اور غم و الم کی کشتیوں نے اپنے بادبان کھول دیئے۔ وہ بولا۔" آپ نہیں جانتے بابو صاحب! دس ہزار روپے تو میں نے اپنی زندگی میں دیکھے ہی نہیں اور نہ دیکھ سکتا ہوں۔ یہاں تو دس پیسے اور ایک مٹھی اناج کے لئے خونِ دل جلانا پڑتا ہے۔"

اس نے ذرا اپنی سانسوں کے اُتار چڑھاؤ پر قابو پاتے ہوئے کہا۔" میں کل سیتا پور گیا تھا، اپنی بیٹی کی منسوب لے کر۔ جانتے ہو! میرے ہونے والے سمدھی نے دس ہزار روپے نقد کا مطالبہ کر دیا۔ اگر آج میں مر گیا ہوتا تو آسانی سے دس ہزار روپے سرکار کی طرف سے میری بیوہ کو مل جاتے اور تب میری بیٹی کا ڈولا میرے گھر سے اُٹھ جاتا۔ اور اس کی ہتھیلیوں میں مہندی رچ گئی ہوتی اور یہ موت میرے لئے ذریعۂ راحت و نجات ثابت ہوتی۔ اس زندگی کو لے کر میں کیا کروں گا۔ جس نے اب تک مجھے در در کی ٹھوکریں بخشیں۔ میں زندگی بھر اس درد کی قبا کو سیتا رہا ہوں۔ اس زندگی میں یوں تو موت کا زہر مَیں کئی بار پی چکا ہوں۔"

پھر وہ نہایت ہی نحیف اور مضمحل آواز میں بولا۔
" اس سے بڑھ کر میرے لئے اور کیا قیامت ہوگی کہ میری جوان جہان بیٹی میرے گھر میں بیٹھی ہوئی ہے اور اس کی سگائی کے لئے میں برادری والوں کے دروازوں پر دستک دے رہا ہوں۔ لیکن کوئی نہیں سنتا۔"

نامہ نگاروں نے قلم سنبھال لئے تھے اور اپنی اپنی ڈائریوں میں آڑے ترچھے حروف سے کچھ لکھتے گئے تھے۔

امیر جان نے ان نامہ نگاروں سے بڑے ہی دردناک لہجے میں کہا۔" تم لوگ کیا لکھنا چاہتے ہو۔؟ میری ایک کہانی یا ان بے نام و نشان لاشوں کی کہانیاں، جنھیں اس حادثہ نے جنم دی ہیں۔ میں تو زندہ ہوں اس لئے بول رہا ہوں لیکن۔ جو اللہ کو پیارے ہو گئے ان کی کہانیاں کون لکھے گا؟ تمہارے قلم ان کہانیوں کو لفظ و معنی کا جامہ نہیں پہنا سکتے۔ جو یہ لاشیں اپنی بے زبانی کی کہانیاں کہہ رہی ہیں۔ ایک بچّہ کی کہانی، ایک ماں کی کہانی، ایک باپ کی کہانی، ایک بھائی کی کہانی۔ کہانیاں ہی کہانیاں۔ ازل سے لے کر ابد تک۔ زندگی ایک مستقل پُردرد کہانی ہے۔ ان کہانیوں کو سُن کر آج کوئی بھی ایک ایسی آنکھ بھی تو نہیں جو نم ہو سکے۔ کاش! میں بھی ان لاشوں کی صف میں شمار کیا جاتا۔ اور میری نہ تو کوئی اپنی کہانی ہوتی اور نہ کوئی نام و نشان۔ یوں میں رسوائی زمانہ سے بچ جاتا۔ مجھے بھی ایک لاش ہی سمجھو۔ کیونکہ دُنیا اب تک مجھے ایک زندہ لاش ہی سمجھتی آئی ہے۔ اور مرنے کی بات! تو میں کتنی بار قسطوں میں مرا ہوں۔ جب بس پُل کی ریلنگ سے ٹکرائی تو یقین جانو میں ایک لمحہ کے لئے بہت ہی خوش ہوا کہ لو مرنے کی آخری قسط بھی ادا ہو گئی۔ لیکن دوسرے ہی لمحہ جب بس پُل کے نیچے آ گئی تو میرے بس کے سب ساتھی ہلاک ہو گئے تھے اور میں بدنصیب زندہ تھا۔ جب میں نے اپنے آپ کو زندہ پایا تو مت پوچھو کہ مجھ پر کیا گذری۔ اور اب کیا گذرے گی کہ قسطوں کی

عرتِ مرگ قسامِ ازل نے اور بڑھادی ہے۔"

ایک تیسرا نامہ نگار پوچھ بیٹھا۔ "آپ یہاں اسپتال سے کب ڈسچارج ہوں گے۔؟" پھر اسی نامہ نگار نے تھوڑے توقف کے بعد کہا۔ "آپ جب گھر جائیں گے تو آپ سے مل کر آپ کے گھر والے بہت ہی خوش ہوں گے۔"

امیر جان نے کہا۔ "ڈاکٹر نے کہا ہے کہ دو روز کے بعد میرا نام یہاں سے کٹ جائے گا۔ اب اس احساس سے میرا کلیجہ پھٹک رہا ہے کہ میں گھر جاکر اپنی بیوی کو کس زبان سے کہوں گا کہ سیتا پور میں، جہاں میری بیٹی کی شادی کی بات چل رہی تھی، وہاں مجھ سے کیا کہا گیا۔؟ جب میں اس سے یہ کہوں گا کہ لڑکے والے نے دس ہزار روپے نقد کا مطالبہ کیا ہے، تو اس غریب پر کیا گذرے گی۔؟"

پھر اس نے کہا۔ "چار سال سے اپنی بیٹی کے رشتہ کے لئے بھٹک رہا ہوں۔ اس چار سال کے اندر اپنی بیٹی کی منسوب لے کر کئی جگہ گیا لیکن سماج کی منڈی میں لڑکوں کے دام اتنے چڑھے ہوئے ہیں کہ کسی غریب لڑکی کی شادی ہونی مشکل ہے۔"

پھر اس نے گلوگیر آواز میں کہا۔ "جانتے ہو بابو! باہر سے جب میں گھر جاتا ہوں تو اپنی بیٹی کی اداس آنکھوں اور مرجھائی شکل کو دیکھ کر مجھ پر کیا قیامت گزرتی ہے۔ اسے میں بیان نہیں کرسکتا۔ آج کل لگن چلا ہوا ہے۔ کسی نہ کسی لڑکی کی بارات روزانہ ہی گاؤں میں آتی ہے۔ ایک ہفتہ ہوا، ٹھاکر رنبیر سنگھ کی بیٹی کی بارات آئی تھی۔ خوب دھوم دھام سے بارات آئی تھی، باجا گاجا تھا، ہاتھی بھی تھا۔ میرے گھر سے ہوکر جب بارات گذری تو میری بیٹی اس بارات میں دولہا کو دیکھکر خوشی سے ناچنے لگی۔ اس کے دل میں نجانے کتنی حسرتوں نے جنم لیا ہوگا۔ دلہن بننے کی حسرت لئے نجانے کتنی لڑکیاں موت نا کی آغوش میں سوگئیں۔"

امیر جان کی آنکھوں سے کئی بار اشکِ غمِ دل ٹپکا جسے وہاں سمجھنے والا کوئی نہ تھا۔

دوسرے روز اخبارات میں یہ خبر شائع ہوئی۔

"رام دھن پور بس حادثے میں بچ جانے والا شخص امیر جان کا دماغی توازن بگڑ گیا ہے۔"

●●

پاگل

پوس کی ٹھٹھرتی ہوئی شام ہولے ہولے رام نگر سے ایک میل دور، زمین کی کوکھ سے نکلنے والی نئی "شیلا نہر" کے اونچے اونچے ٹیلوں پر اترنے لگی، اور جب کچے اور پھوس کی زمین بوس جھونپڑیوں سے دھوئیں کے اٹھتے ہوئے مرغولوں کو آسمان کی پہنائیوں میں جائے اماں نہ ملی تو وہ دھرتی کے سینے سے لگ کر اپنی بے پناہی کا ماتم کرنے لگے کہ آسمان کی فضائیں بوجھل تھیں اور یہ پوری دھرتی، جوان جھونپڑیوں میں بسنے والے اور شیلا نہر میں کام کرنے والے مزدوروں اور سخت جفاکشوں کے قافلے کے لئے جائے اماں تھی، دھواں دھواں سی ہو گئی تھی، گھٹن اور حبس کی اس فضا میں جیسے ان انسانوں کے ساتھ ساتھ اس دھرتی کا بھی کلیجہ پھنک رہا ہو "شیلا نہر" جس کی کھدائی پانچ برسوں سے ہو رہی تھی۔ اب شاید بن کر تیار ہو چکی تھی۔ اسی لئے ان جھونپڑیوں کے مزدور مردوں، عورتوں اور بچوں کے چہرے اداس تھے۔ ان کی آنکھوں میں چٹیل بنجر زمینوں اور صحراؤں کے سونے پن اور خشکیوں نے ڈیرے ڈال رکھے تھے کہ اب کام بند ہونے والا تھا اور کام کے عوض روٹی ملنے کا سہارا بھی ٹوٹنے والا تھا۔ اب انہیں دو مٹھی اناج کے لئے نجانے کہاں کہاں بھٹکنا پڑے گا۔ اس روح فرسا احساس کی چتا پر ان کا وجود جل رہا تھا۔ دوسری طرف بڑے ٹھیکہ دار دیو راج اور ان کے ماتحت کام کرنے والے درجنوں چھوٹے چھوٹے ٹھیکہ داروں کے چہرے بشاشت، طمانیت اور کامرانی سے کھل اٹھے تھے کہ شیلا نہر اب بن کر میلوں نیل ناگن کی طرح بل کھاتی ہوئی ان کے سامنے اٹھلا رہی تھی۔ اب ان کے بلوں کے بقایا روپے کی ادائیگی

ہونے والی تھی اور اب اس کا افتتاح پرسوں ہی لیڈروں اور اعلیٰ افسروں کی موجودگی میں ہونے والا تھا۔

آج رام نگر کے پنچایت بھون میں میٹنگ بلائی گئی تھی۔ اور یہ سوال اُٹھایا گیا تھا کہ اس "شیلا نہر" کا افتتاح کس کے ہاتھوں انجام پائے، اس میٹنگ میں پرمکھ کے علاوہ اس حلقہ کے ددودھانگ بھی موجود تھے۔ اور پنچایت کے تمام مکھیاؤں نے بھی شرکت کی تھی۔ کچھ لوگوں کی رائے تھی کہ اس کا افتتاح مرکز کے کسی وزیر سے کرایا جائے۔ تو کچھ لوگ اس خیال کے حق میں تھے کہ اس نہر کا افتتاح راجیہ کے مکھ منتری سے کرایا جائے۔ کچھ لوگوں نے اس ڈویژن کے کمشنر صاحب کا نام لیا تو کچھ لوگوں نے مشورہ دیا کہ اس نہر کا افتتاح رام نگر کے سب سے بوڑھے، ایمان دار اور مجاہد آزادی سے کرایا جائے جس نے اپنا سارا جیون تیاگ اور جن سیوا میں بتایا ہو۔ اس سلسلے میں بیک وقت سبھوں کی زبانوں پر "کرمو میاں" کا نام آگیا جن کی عمر ۸۵ سال سے زیادہ تھی جو اب چلنے پھرنے سے بھی مجبور تھے۔ اس حلقہ کے ددھانگ کے علاوہ پرمکھ اور تمام مکھیاؤں نے حامی بھر لی اور پنچایت بھون میں یہ بات طے پائی کہ اس حلقہ کے ودھانگ، اس پنچایت کے پرمکھ، رحمٰن پور کے مکھیا اور رام نگر بلاک کے سرکل آفیسر کرمو میاں کے پاس جائیں اور انہیں اس کام کے لئے آمادہ کریں۔

گاؤں کے پورب آخری چھور پر، جہاں کمزور اور پس ماندہ طبقے کے لوگ زیادہ آباد تھے۔ کرمو میاں کی جھونپڑی تھی جہاں وہ اپنی زندگی کے آخری ایام بڑی تنگ دستی اور عسرت سے گذار رہے تھے۔ جب یہ چاروں آدمی کرمو میاں کی جھونپڑی کے چار فٹ اونچے دالان میں سر نہوڑا کر داخل ہوئے تو مٹی کی اس کوٹھری کے اندر سے کسی بوڑھے کے کھانسنے کی بڑی ہی خفیف آواز نے ان کا خیر مقدم کیا۔ جیسے یہ آواز کسی کی زندگی کی آخری آواز ہو۔ آخری ہچکی، سانس کا آخری

اُتار چڑھاؤ، جس سے بے بسی، مفلسی اور غربت کا اعلان ہو رہا تھا۔ یہ کرمو میاں کے کھانسنے کی آواز تھی۔ جس نے آنے والوں کے ذہنوں کے تاروں کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ بعض آوازیں جو الفاظ و معنی کے پیراہن سے عاری ہوتی ہیں لیکن اس بے لباسی کے باوجود یہ آوازیں نہ جانے کون سی ایسی طاقت رکھتی ہیں کہ کانوں کے، ذہنوں کے، روح کے، بصیرت اور بصارت کے تمام دروازے یکلخت کھول دیتی ہیں، اور انسانوں کی بے حسی کو اپنی ایک ضرب صدا سے ٹھوکریں مار کر جگا دیتی ہیں۔ کرمو میاں کے کھانسنے کی یہ آواز گویا آنے والوں کے لئے صدائے جرس نکلی۔ کہ وہ اس جھونپڑی کے باہر ایک دوسرے کو ندامت اور معنی خیز نگاہوں سے دیکھنے لگے۔

معاً کرمو میاں جھونپڑی کے اندر سے لاٹھی ٹیکتے ہوئے نکلے اور بولے۔

"تم لوگ کون ہو بھائی۔ بیٹھو۔ میں اپنی کٹیا سے کھٹیا لاتا ہوں۔"

"نہیں کرمو بابا۔ تم اتنی تکلیف نہ کرو۔ ہم لوگ تمہارے اسی رام نگر اور رحمٰن پور گاؤں کے رہنے والے ہیں۔" مکھیا نے سبھوں کا تعارف کرانا چاہا تو بیچ میں کرمو میاں بولے۔

"خیریت تو ہے۔ ادھر تم لوگ کبھی نہیں آئے۔ آخر کیسے آنا ہوا۔"

کرمو میاں کو کھانسی ستانے لگی۔ انہوں نے بڑی مشکلوں سے اپنی کھانسی پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ "ارے۔ ہمارے تو بھاگ جاگ گئے کہ آپ لوگن کے قدم اس کٹیا میں پہنچ گئے۔"

"ہم لوگ ایک ضروری کام سے آئے ہیں کرمو دا۔" ودھا ٹنک جی بولے۔

"ہم گریبن لوگن سے کون سا کام ہے۔ اب تو ہم کسی کام کے نہیں رہے۔ ہاں جب جوان تھا، تو دیش کے کام آیا تھا۔" پھر وہ جیسے کسی سہانے خواب میں کھو گئے۔ بولے۔ "جو سمے اور جو عمر دیش اور جنتا کی سیوا میں گذر جائے در اصل وہی سمے اور وہی عمر قیمتی ہیں اور یاد رکھے جانے کے قابل ہیں۔" پھر آپ ہی آپ بولے۔

"لیکن بابوجی! ان لمحوں کو کون یاد رکھتا ہے اور کون اس کی قدر اور اس کا آدر مان کرتا ہے۔ سب لوگ بھول گئے۔ بھول گئے۔" کرمو میاں جیسے اُبل پڑے، ایسا معلوم ہوا کہ وہ زمانے سے بولنے کے لئے ترس رہے تھے۔ آدمی کی تلاش میں تھے۔ جس سے وہ اپنے دل کا حال بیان کریں۔

جھونپڑی کے اندر سے ایک پندرہ سالہ لڑکا اپنے ہاتھ میں کھٹیا اور چٹائی سنبھالتے ہوئے نکلا اور اسے مٹی کے فرش پر بچھاتے ہوئے بولا۔ "آپ لوگ بیٹھئے۔"

کھٹیا اور چٹائی پر سبھی بیٹھ گئے۔ کرمو میاں چٹائی پر بیٹھتے ہوئے بولنا چاہ رہے تھے کہ مکھیا نے بیچ میں ٹوک دیا۔ "آپ کو اس عمر میں کسی قسم کی سرکاری مدد ملتی ہے یا نہیں؟"

کرمو میاں بہت ہی ڈوبتے ہوئے لہجہ میں بولے۔ "ہم نے اب تک اس دیش اور راشٹر کو دیا ہے، اس سے کچھ لیا نہیں ہے۔ اب بھی میرے اس بوڑھے جسم کی رگوں میں تھوڑا بہت جو خون بچا ہوا ہے، اسے اپنی اس دھرتی ماں پر نچھاور کر دینا چاہتا ہوں۔ اب آخری عمر میں کون کس سے مانگنے جائے اور اس کا حساب اپنے اوپر والے مالک کو کون دے۔ چلو اچھا ہوا کہ اپنی جھولی میں کچھ نہیں ہے۔"

ان کے لہجے میں بڑا تیقن اور اعتماد تھا۔ پھر وہ اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے بولے۔

"ویسے بتاؤ، کون سے کام کے لئے میرے پاس آئے ہو۔"

"یہ شیلا نہر ابھی جو بنی ہے نا، اس کا اُدگھاٹن ہم لوگ آپ ہی سے کرانا چاہتے ہیں۔"

"وہ کیوں۔ مجھ ہی سے کیوں؟"

اس لئے کہ آپ سے بڑھ کر اور کوئی زیادہ ہم لوگوں کی نظروں میں دیش بھگت اور مجاہد آزادی نہیں ہے۔"

"ہم سے بڑھ کر ایک اور شخص ہے جسے تم لوگ شاید نہیں جانتے۔" کرمو میاں نے جواب دیا۔

"اس جوار میں کوئی تو ایسا شخص نہیں ہے، جو اس کا اہل ہو۔ جس نے دیش کے لئے قربانیاں دی ہوں۔"

"ہاں ایک شخص اور ہے جسے میں جانتا ہوں۔ اس کے پورے خاندان کو آج سے ۵۰ سال قبل انگریزوں نے اس لئے تباہ و برباد کر دیا تھا کہ وہ جنگ آزادی میں آگے آگے تھا اور ایک گورے کا قتل کر کے فرار ہو گیا تھا۔ اور اس کے خاندان والوں نے اس کا پتہ نہیں بتایا تھا۔"

کرمو میاں کو پھر زوروں سے کھانسی اٹھی، کھانستے کھانستے ان کی گردن کی رگیں پھول گئیں اور آنکھوں میں جیسے خون اتر آیا۔ کچھ کھانسی تھمی تو وہ سانسوں کے زیر و بم کے درمیان بولے۔ "ان کے خاندان والوں کو بھی اس کا پتہ معلوم نہیں تھا کہ وہ کہاں روپوش ہے۔ وہ بتاتے تو کس طرح بتاتے اور جب ملک آزاد ہوا تو یکایک ہم لوگوں نے اسے اس پچھم والی پہاڑی کی طرف سے آتے ہوئے دیکھا جہاں کبھی انگریزی فوجوں کی چھاؤنی قائم تھی۔

"وہ تو اب اس علاقے میں نظر آتا ہے۔ لیکن بابا وہ تو پاگل ہے ایک دم پاگل۔" پرمکھ نے کہا۔

"ہاں اسی پاگل سے اس نہر کا افتتاح کراؤ۔ اگر تم ہمارے کھیتوں کی سیرابی چاہتے ہو۔ میں اس کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں کچھ بھی نہیں۔ ان آدرشوں کی قدر کرو۔ جنھیں ہم بھول گئے ہیں۔" کرمو میاں بولتے چلے گئے۔ "تم آزادی کے انہیں شہیدوں کی تربت اور سمادھی پر پھول چڑھاتے ہو جنھیں اتہاس کے پنوں نے جگہ دی ہے۔ آزادی کے ان شہیدوں کو بھی یاد کرو جو بے نام و نشان آزادی کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھ گئے۔ آزادی کے ان جیالوں کی بھی قدر کرو جنھیں آج

دنیا قدر کی نگاہوں سے نہیں دیکھتی ہے اور تم نہیں جانتے کہ ان کے دلوں پر سنگینیٔ حالات نے کون سے ایسے گہرے زخم لگائے ہیں جنھیں وہ ایک امانت کی طرح اپنے سینوں میں چھپائے پھرتے ہیں۔"

"وہ آدمی کہاں ہو گا؟" سبھوں نے کرمو میاں سے سوال کیا۔

"اسے بچوں سے بہت پیار ہے۔ وہ زیادہ تر بچوں میں کھیلتا ہوا ملے گا۔ تم لوگ ندی کے کنارے چلے جاؤ، جہاں بچے کھیلتے رہتے ہیں۔"

وہ چاروں کرمو میاں کی جھونپڑی سے نکل آئے۔ دوپہر ہو چکی تھی اور سردی کے اس موسم میں دھوپ بڑی بھلی اور سہانی معلوم ہو رہی تھی۔ وہ لوگ سیدھے ندی کے کنارے پہنچ گئے۔ وہاں ان لوگوں نے دور سے دیکھا کہ گاؤں کے کچھ بچے اور لڑکیاں گڈّے اور گڑیا کا بیاہ رچا رہی ہیں۔ ریت کی ایک مسجد بنائی گئی ہے اور ایک مندر۔ اس کھیل میں ہندو مسلمان اور پس ماندہ طبقے کے بچے اور بچیاں شامل ہیں۔ باراتی میں کئی لڑکے ٹوپی پہنے ہوئے ہیں اور کئی لڑکوں نے دھوتی پہن رکھی ہے اور ماتھے پر لال ٹیکا لگا رکھا ہے۔ گویا کہ گھر کے باراتیوں کے سواگت کے لئے بچے اور بچیاں کھڑی ہیں اور ایک چھوٹے سے ڈھولک پر بچیاں گیت گا رہی ہیں۔ ایک لڑکا ٹین کا کنستر لئے پیٹ رہا ہے اور ایک لڑکی ہاتھ میں گھنگھرو لئے بجا رہی ہے۔ وہاں پر ایک درخت کے نیچے ایک شخص بیٹھا ہوا ہے جس کے سر اور داڑھی کے بال بے تحاشا بڑھے ہوئے ہیں۔ ہاتھ اور پاؤں کی انگلیوں کے ناخن نوکیلے اور تیز کٹار جیسے نکلے ہوئے ہیں۔ آنکھوں میں کیچ ہے اور منہ سے رال ٹپک رہی ہے۔ جو اس کی داڑھی کو تر کر رہی ہے۔ کپڑوں سے بے نیاز جسم پر میل کی موٹی سی تہہ جمی ہوئی ہے۔ بچوں کے اس کھیل کو دیکھ کر وہ بہت ہی خوش ہو رہا ہے اس کا انگ انگ ناچ رہا ہے اور وہ اپنے آپ میں مست ہے۔

"یہی وہ شخص ہے جس کے بارے میں کرمو بابا نے کہا ہے۔"

"لیکن یہ تو سچ مچ پاگل دکھائی دیتا ہے۔" ایک نے تبصرہ کیا۔
"ایسے آدمی کو شیلا نہر کے افتتاح کے لئے کیسے لے جایا جا سکتا ہے۔"
دوسرا بولا۔

اچانک ندی کے کنارے بچّوں کے غول میں شور اٹھا۔ بچّے اب دو ٹولیوں میں بٹ گئے اور آپس میں شور مچانے لگے۔ "مارو، پکڑو" چھوٹے چھوٹے معصوم بچّے کاغذوں کی بنی ہوئی مصنوعی تلواریں اور برچھوں سے ایک دوسرے پر حملے کرنے لگے۔ ریت کی بنی ہوئی مسجد ڈھادی گئی اور مندر کو مسمار کر دیا گیا۔

وہ شخص اس منظر کو نہ دیکھ سکا۔ اور اس کے منہ سے جھاگ نکلنے لگی۔ وہ زور سے چیخا۔ "بچو! یہ کھیل بند کرو۔ کھیل بند کرو"۔ بچّے ہنستے، کھیلتے، کودتے اپنے گھروں کی طرف بھاگنے لگے۔ کھیل ختم ہو گیا تھا، اور پاگل انہیں رگید رہا تھا۔

●●

نیند کیوں رات بھر نہیں آتی

رات میں اچانک اس کی نیند ٹوٹ گئی ہے وہ اپنے بستر پر اُٹھ کر بیٹھ گیا ہے اور اس کا دل پھر اتنا زور سے دھڑکنے لگا ہے کہ اس کی آنکھوں میں موت کے سیاہ سائے ناچنے لگے ہیں۔ وہ متوحش نگاہوں سے اِدھر اُدھر دیکھتا ہے لیکن اس چھوٹے سے کمرے میں کوئی نہیں ہے۔ بجلی بھی شام ہی سے اس کی قسمت کی طرح روٹھی ہوئی ہے اور اس بڑی کالونی میں چلی گئی ہے، جہاں بڑے بڑے افسروں کی کوٹھیاں ہیں۔ کمرے میں صرف ایک لالٹین جل رہی ہے۔ جس کا تیل بھی اس کے چراغِ زندگی کے روغن کی طرح ختم ہوا چاہتا ہے۔ اس کے دل و دماغ میں ایک طوفان سا اُٹھا ہوا ہے۔ خیالات و تفکرات کی گرم تند ہوائیں اس کے دل و دماغ کو جھلسائے دے رہی ہیں۔ وہ اپنے آپ کو تسلّی دینا چاہتا ہے لیکن نہ نیند ہی آئی اور نہ ہی دل کی دھڑکن تھمی۔

جب رات کے بارہ بجے تو مشکل سے اس کی آنکھ لگی۔ اُس وقت بھی اس کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ محلہ میں ایک بارات آئی ہوئی تھی۔ بارات گشت کرنے کے لئے نکلی تھی۔ آتشبازیاں چھوڑی جا رہی تھیں۔ پٹاخے داغے جا رہے تھے۔ ڈھول اور باجے کے شور سے کان پڑی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ وہ ہنگامہ اور طوفان بدتمیزی اُٹھا کہ الاماں۔ معلوم ہوا کہ یہ بارات حاجی عبدالرشید کے یہاں آئی ہوئی ہے۔ جس نے لڑکے والوں کی منہ مانگی تمام فرمائشوں کو پورا کیا تھا۔ رنگین ٹیلی ویژن، ریڈیو، ریڈیوگرام، گودریج کی الماری، فرنیچر،

صوفہ سیٹ، فریج، چینی اور اسٹین لیس اسٹیل کے برتن باسن اور الم غلم۔ اور پھر اس پر نقدہ ۲۵ ہزار روپے۔ یہ سن کر اس کا دل اس وقت سے جو دھڑکنا شروع ہوا تھا وہ اس وقت تک دھڑکتا رہا جب تک، کہ اس کی آنکھ نہیں لگی۔ کیونکہ اس کی کنواری بیٹی گھر میں بیٹھی ہوئی تھی اور اس کی جھولی میں اتنے پیسے نہیں تھے کہ وہ اپنی بیٹی کے لئے کسی لڑکے کو خرید سکتا تھا۔ حاجی عبدالرشید ہی کے یہاں صرف ایسی بارات نہیں آئی تھی بلکہ ادھر ایک مہینہ کے اندر محلے میں جتنی شادیاں ہوئی تھیں، ان میں جہیز کے ناجائز مطالبات کو ہی دخل تھا۔ ایسے موقعوں پر سرمایہ داری کے گھناؤنے مظاہرے دیکھنے میں آئے تھے۔

اب کلیم میاں کی بیٹی کی بارات کو ہی لے لیجئے جو پرسوں یہاں ایک نزدیک کے ایک گاؤں سے آئی تھی۔ بارات شہر کے ایک مشہور ہوٹل میں ٹھہرائی گئی۔ ایک روز کا قیام رہا۔ تیسرے روز بارات واپس گئی۔ کلیم میاں نے اپنے سمدھی کے ہر چھوٹے بڑے مطالبہ کو پورا کیا۔ نقد روپے کے علاوہ جہیز میں فرمائش کے مطابق ہر قسم کا سامان دیا۔ کھیت بیچنے پڑے۔ سرمایہ داروں کی بیٹیاں تو آسانی سے سونے اور چاندی کے ترازو میں تل کر اپنی سسرال چلی جاتی ہیں۔ لیکن برادری اور سماج کی ان بیٹیوں کا کیا ہوگا، جن کی آنکھیں کسی بابل کے انتظار میں چوکھٹ پر لگی ہوتی ہیں اور جن کی ہتھیلیوں کا سونا پن مہندی کو ترس رہا ہے۔ اور جو محض اس لئے کنواری بیٹھی ہوئی ہیں کہ ان کے ماں باپ غریب ہیں۔

جب بھی کوئی بارات اس کے محلے میں آتی تو اس کا دل یہ سوچ کر دھڑکنے لگتا کہ آخر اس کی بیٹی کا کیا ہوگا؟ اور اس وقت تو اس کے دل کی عجیب کیفیت ہوتی جب اس کی بیٹی کسی بارات کو حسرت بھری نگاہ سے دیکھتی۔ وہ خوشی سے تالیاں بجاتی ہوئی اپنی ماں کو پکارتی "آیئے نا۔ دیکھئے نا۔ کتنی اچھی بارات سج دھج کر نکلی ہے۔ دولہا کیسے منہ پر رومال رکھے ہوئے کار پر بیٹھا ہوا ہے۔"

آہ! اس کی بیٹی پر اس وقت کیسی قیامت گذرتی ہوگی۔ اس درد اور کرب کو وہ لوگ کیا جانیں، جو اپنی بیٹیوں کے لئے لڑکے خریدتے ہیں۔

اور بھی سوچ اور فکر اس وقت، جب کہ رات اپنا آدھا سفر طے کر چکی ہے، اور دبے پاؤں گذر رہی ہے، اور اب شاید صبح ہونے والی ہے، اس کے دل و دماغ کو بری طرح گرم سلاخوں کی طرح داغ رہی ہے۔ اور اس کا دل بری طرح دھڑک رہا ہے۔

دنیا میں دل کی بہت ساری رنگین داستانیں مشہور ہیں۔ اور بہت ساری حسین عبارتیں اس ایک دل نامراد سے منسوب ہیں، جو کتابوں میں محفوظ ہیں۔ لیکن ان داستانوں میں کہاں تک صداقت اور حقیقت ہے، جن میں دل کی حسین واردات اور قلب جاں گداز کے سہانے خواب اور واقعات کی رنگ آمیزی ہے، وہ نہیں کہہ سکتا۔ نجانے وہ کیسے خوش نصیب لوگ ہونگے جن کو فرصت کے دن رات میسر ہوتے ہوں گے اور جو تصورِ جاناں کئے بیٹھے رہتے ہوں گے اور جن کی زندگی کے آنگن میں محبت اور پیار کے رنگین پھول کھلتے ہوں گے اور جنھوں نے محبت کرنے کے جرم میں سزائیں بھی پائیں، انہیں سنگسار بھی کیا گیا اور جن کا بدن لہو لہان بھی ہوا ـــــ اس نے تو جن کٹھور اور سنگین حالات میں آنکھیں کھولیں، اپنے چاروں طرف حوادث زمانہ اور بے وفا انسانوں کی ستم ظریفیاں ہی دیکھیں۔ اس کے پاس دل آغشتہ خوں اور چشم پرنم کے سوا اور کیا ہے۔ اس کی ماں نے اسے پہلی بار جس ردائے حیات میں لپیٹ کر پالنے میں رکھا تو وہ شروع ہی سے اتنی تار تار تھی کہ ٹانکے کی ہلکی سی چبھن بھی وہ ردا نہیں سہہ سکی۔ البتہ اس کی انگلیاں سوئی کے وقت ضرور لہو لہان ہوگئیں۔

لیلیٰ مجنوں، شیریں فرہاد اور ہیر رانجھا کی محبت بھری داستانیں کبھی

اپنے اندر اتنی جاذبیت اور کشش رکھتی ہوں گی کہ غمزدہ انسان تھوڑی دیر کے لئے اس فضائے رنگین میں اپنے آپ کو کھو دیتا ہوگا۔ لیکن اب۔ اب یہ ساری داستانیں تاریخ کے صفحات کی زینت بن چکی ہیں اور اب ان میں کوئی جان نہیں، کوئی جاذبیت نہیں۔ اب اتنی فرصت بھی نہیں کہ وہ انہیں پڑھ کر، اس ماحول میں اپنے آپ کو کھو سکے اور کرب ناک حالات سے منہ موڑ کر اپنے آپ کو دھوکا دے سکے کہ شاید بعض لوگوں کی عمر درازی کا ایک یہ بھی راز ہے۔ لیکن اب تو عمر درازی کی یہ دعائیں جو کبھی اس کے والدین نے اسے دی تھیں، وبالِ جان بن گئی ہیں۔ مولا نے جینے کی شرط لگا دی ہے کہ وہ مر بھی نہیں سکتا۔ خودکشی بھی نہیں کر سکتا کہ یہ حرام کی موت قرار دے دی گئی ہے۔

حرام کی موت اور حرام کی زندگی کیا ہوتی ہے۔؟

وہ اپنے آپ سے پوچھتا ہے۔

حرام کی موت کیا ہوتی ہے۔ اس سوال کا وہ جواب نہیں دے سکتا۔ وہ اس زندگی کو البتہ ضرور جانتا ہے جو حرام سے بھی بدتر ہے اور جسے بدبخت انسان فخر کے ساتھ ڈھوئے پھرتا ہے۔ میں اس سیٹھ کو ضرور جانتا ہوں جو ذخیرہ اندوزی، بلیک مارکٹنگ کرتا ہے اور غریب عوام کا استحصال کرتا ہے۔ اور سماج میں ایک معزز شخص سمجھا جاتا ہے۔ وہ اس مولانا کو ضرور جانتا ہے جو اپنے سر پر عبا زیب تن کئے ہوئے ہے۔ اور جس نے اپنی بہو کو محض اس لئے گھر سے نکال دیا کہ وہ اپنے میکے سے جہیز کا خاطر خواہ سامان ساتھ میں نہیں لائی تھی۔ وہ اس بڑے ٹھیکہ دار کو جانتا ہے جس نے چند سکوں کے عوض کتنی نوخیز کامگار لڑکیوں کی آبروریزی کی اور جو سماج میں عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ وہ اس خونی اور ظالم انسان کو جانتا ہے جس نے اپنے مفاد کے لئے پچھلے دنوں گاؤں کی جھونپڑیوں کو نذرِ آتش کروایا اور اس میں غریبوں کی کتنی جانیں جھلس گئیں۔ حرام کی زندگی بسر کرنے والے ان

انسانوں کی موت سب سے زیادہ گھناؤنی اور ناپاک ہو گی۔ حرام موت کیا ہے؟ اور حلال زندگی کیا ہے؟ اسے آج کا انسان نہیں جانتا۔ برائی کیا ہے اور بھلائی کیا ہے، اس کے پرکھنے کی کسوٹی کتنے لوگوں کے پاس ہے؟ کھرے اور کھوٹے کی تمیز کس کو ہے؟

بغل والے کمرے میں اس کی بیوی اپنی اس اکلوتی کنواری بیٹی کے ساتھ سوئی ہوئی ہے، جس کی شادی کے لیے وہ دن رات اس سے لڑتی رہتی ہے۔ مگر لڑنے سے کیا ہو گا؟ لڑنے سے مسئلے کا تو حل نہیں ہو سکتا۔ اگر لڑنا اور جان دے دینا کسی مشکل مسئلہ کا حل ٹھہرتا تو وہ برادری کے لوگوں کو چیخ چیخ کر بلاتا اور کہتا "اسے سنگسار کر دو اور اس کی چمڑی ادھیڑ دو۔ لیکن بچی کے لیے کوئی بر ڈھونڈو اور اس کی شادی کروا دو۔" وہ جانتا ہے کہ اس کے درد بھرے الفاظ برادری والوں پر اپنا اثر نہیں کر سکتے۔ اگر اس نے اپنی کمزوری اور مجبوری کا اظہار دبے لفظوں میں کیا بھی تو برادری میں اس کا رہا سہا بھرم بھی جاتا رہے گا۔ اس کا لوگ مذاق اڑائیں گے۔ اس پر پھبتیاں کسیں گے اور پھر اچھے کاز کے لیے اس دنیا میں جان دینا کوئی اہمیت رکھتا تو پھر برائیوں اور سماج میں پھیلی ہوئی لعنتوں کا سدِ باب ہو جاتا۔ یہ جہنم زار دنیا جنت بداماں ہو جاتی۔ جن کے لیے جان دینے والوں کی کمی نہیں ہے۔ کوئی تو صلیب پر چڑھا دیا گیا، کوئی دار پر لٹکا دیا گیا، کسی نے زہر کا پیالہ پیا، کوئی شہید ہوا، کسی کو سنگسار کیا گیا۔ اور یہ سلسلہ آج تک جاری ہے۔ آج بھی کسی نہتے، کمزور بوڑھے انسان کی ہتھیا اس لیے کر دی جاتی ہے کہ وہ سچ کیوں بولا۔

اس کے کانوں میں اچانک ریڈیو کی ماتمی دھن سنائی دے رہی ہے حالانکہ ریڈیو بند ہے۔ لیکن ابھی تک اس کے ذہن و دماغ میں شام کی المناک خبر گشت کر رہی ہے۔ وہ بے چین سا ہو جاتا ہے اور لالٹین کو بجھا دیتا ہے۔ لیکن اندھیرا

اس کے تصور کی سماعت پر پہرے نہیں بیٹھا پاتا اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ چاروں طرف خونخوار بھیڑیا صفت انسان اس کے چاروں طرف ننگا ناچ، ناچ رہے ہیں اور اس سے کہہ رہے ہیں:

"تم حقیقت کی دنیا میں واپس آجاؤ۔ تم خیالی گھوڑے دوڑا کر زندگی کی مثبت اور اعلیٰ قدروں کے پیکر تو ابھار سکتے ہو لیکن ان میں کوئی حقیقت نہیں۔ حقیقت تو صرف یہ ہے کہ آج ایک عورت کا قتل ہوا ہے اور اسے حق گوئی، امن اور اتحاد کی پیغامبری کی سزا مل گئی ہے اور یہ ہوتا آیا ہے اور ہوتا رہے گا۔"

وہ چیخ اٹھتا ہے۔

"یہ نہیں ہو سکتا۔ اس کے تصورات اور اس کے خیالات پر تم قدغن نہیں لگا سکتے۔ تم یہ سمجھتے ہو کہ اس خاتون کے قتل سے اس کے تمام مشن کا قتل ہو گیا ہے تو غلط ہے۔ تم نہیں دیکھ رہے ہو کہ اس کے خون کا قشقہ مادرِ وطن کی پیشانی پر ایسا لگا ہے کہ اس کی تابانی اور رونق دوبالا ہو گئی ہے اور اس کے جیالے سپوت ہاتھوں میں امن و آشتی کی قندیلیں لے کر اب سڑکوں پر نکل آئے ہیں۔ تم اس روشنی کو قتل کر و تو جانیں۔ یہ قتل در اصل فرقہ پرستوں اور تخریب کاروں کے لئے اعلانِ مرگ ہے۔ ایک نیا ہندوستان اس قتل کے بعد زندہ ہو گیا ہے۔"

وہ کیا کرے کہ اب رات تیزی سے گذر رہی ہے اور اس کا دل اور تیزی کے ساتھ دھڑک رہا ہے، یہ جان لیوا احساس اس کے دل و دماغ پر ہتھوڑے برسا رہا ہے کہ اب صبح ہونے والی ہے۔ اب نزدیک کی مسجد سے مؤذن کی آواز گونجے گی اور اس کی بیٹی اور بیوی نماز کے لئے اٹھے گی۔ وضو بنائے گی اور اسے بھی نماز کے لئے اٹھائے گی اور وہ حسب دستور اپنی بیٹی کا اداس چہرہ دیکھے گا۔ وہ روزانہ ہی اس کرب سے دوچار ہوتا ہے۔ اس کی جھیل جیسی صاف و شفاف آنکھیں، اس کی اونچی اور صندلی پیشانی کی لکیریں اس سے بہت کچھ کہہ جاتی ہیں۔

وہ اس کے حدیث غم دل کی تفسیر بیان نہیں کر سکتا۔ وہ باپ ہے نا! بیٹی کے دکھ درد کو وہ نہیں سمجھے گا تو کون سمجھے گا!

اے شب غم تیری عمر دراز ہو کہ وہ بہت تھک گیا ہے اور سونا چاہتا ہے ایک لمبی نیند، میٹھی اور ابدی نیند کہ صبح اس کی بیٹی اسے اس نیند سے جگا نہ سکے۔ زندگی بھر اس کی آنکھیں پُر سکون نیند کے لئے ترستی رہی ہیں۔ اب وہ آرام کرنا چاہتا ہے۔ آرام کرنا چاہتا ہے۔

●●

دودھ کا رِشتہ

سلّو کا اصل نام شاید کبھی سلامت حسین رہا ہوگا۔ لیکن اب تو گاؤں والے اسے سلّو کے نام سے ہی پکارا کرتے تھے۔ نام چہرہ، حُلیہ اور رنگ کو بھی دراصل وقت کے بے رحم ہاتھ اس طرح مسل کر رکھ دیتے ہیں کہ وہ اپنی اصلی شناخت بھی کھو دیتے ہیں اور روزی روٹی کے چکر میں بعض آدمیوں کا وجود ایسا غائب ہو جاتا ہے کہ اس بھری پُری دنیا میں انہیں کوئی پہچانتا بھی نہیں۔ سو سلّو کا اصل نام جو کبھی اس کے غریب ماں باپ نے گاؤں کے مولوی صاحب سے "نام نہادی" کی رسم کے موقع پر قرآن شریف کے مقدس صفحات کی مدد سے سلامت حسین نکلوا دیا تھا، وہ بگڑ کر صرف سلّو ہی رہ گیا تھا۔

اور میں بھی اسے سلّو کے نام سے ہی جانتا تھا۔ وہ میرے گھر میں گاؤں کے بلاک کے سامنے والے چاپاکل سے پینے کا پانی بھر دیا کرتا تھا۔ میں اسے بچپن سے ہی پانی بھرتے دیکھتا آیا ہوں۔ اسے ہر ماہ اس پانی بھرنے کی اُجرت میں میرے گھر سے دس روپے ماہوار ملا کرتے تھے۔ وہ میرے گھر کے علاوہ دوسرے گھروں میں بھی پانی بھرا کرتا تھا۔ اسے ہر گھر سے صبح، دوپہر اور شام کو کھانے کے لئے بھی کچھ نہ کچھ ضرور مل جایا کرتا تھا۔ ورنہ اس زمانے میں دس بیس روپے سے کیا ہوتا ہے۔ یہ روپے تو دراصل اس کے حقہ پانی میں کام آتے تھے۔ یا پھر وہ ان روپوں کو شاید بچا کر رکھتا ہوگا ہاں وہ ان روپوں کو ضرور بچا کر رکھتا ہوگا کیوں کہ اس کی شادی نہیں ہوئی تھی اور وہ اپنی شادی کے لئے بڑے سہانے خواب دیکھا کرتا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ

اس کی جھونپڑی میں اِس کی بٹیا بیاہ کر آجائے۔ اس کی شادی کی بات جب کہیں چلی تو اڑچن لگ جاتی۔ جب کوئی لڑکی والا سنتا کہ لڑکا گاؤں میں پانی بھر کر اپنی گزراوقات کرتا ہے تو وہ بدک جاتا۔ پانی بھرنے کا کام بھی کوئی کام ہے۔ کیا کوئی لڑکی کا باپ اپنی لڑکی کو اس سے اسی لئے بیاہ دے کہ وہ اس کے گھر جاکر "پنی بھرنی" بن جائے اور زندگی دوسروں کے گھڑے ڈھوتے ڈھوتے اس کی کمر پر گھٹے پڑجائیں۔ اور اس کی نرم و نازک ہتھیلیاں پانی بھری ہوئی بالٹی کے بوجھ سے مسک مسک کر، ڈھول پر چڑھے چمڑے کی طرح سخت ہو جائیں؟

"نہ بابا نہ۔! ہم اس لڑکے سے اپنی بیٹی کا بیاہ نہیں کر سکتے۔"

زیادہ تر لڑکی والوں کا جواب یہی ہوتا۔

لیکن اس زمانے میں سلّو جیسا غریب لڑکا بھی کہاں ملتا ہے؛ وہ لڑکی کا باپ کیا کرے جس کے گھر میں کنواری جوان بیٹی اوڑھنی، قمیص اور شلوار کو ترس رہی ہو۔ جس کے الجھے چڑیوں کے گھونسلے کی طرح سر کے بال تیل اور کنگھی کے محتاج ہوں اور جن میں گدر گدر جوئیں رینگ رہی ہو جسے ایک وقت بھی ماڑ میسر نہیں اور جس کی آنکھوں کے کنول اپنے بَر کا انتظار کرتے کرتے بجھ گئے ہوں۔ یہی سب سوچ کر رحمت میاں سلّو سے شادی کرنے کے لئے اپنی بیٹی کو دینے کے لئے تیار اور راضی ہو گئے۔

"گھر میں جوان بیٹی کو بٹھا کے رکھنا ٹھیک نہیں۔ نہ جانے غربت اسے کون سے پاپ کے کنوئیں میں ڈھکیل دے اور اس کی ناک کٹ جائے۔ شوہر کے ساتھ نمک روٹی تو اسے عزت کے ساتھ ملے گی۔" اور رحمت میاں نے اپنی بیٹی کا بیاہ سلّو سے کر دیا۔

شبن سلّو کے گھر دلہن بن کر آگئی۔ اور دوسرے ہی روز اس نے میرے گھر آکر اپنا گھونگھٹ اس طرح اُتار دیا۔ "لے چل بالٹی ہاتھ میں اُٹھا اور یہ گھڑا پکڑ۔" اور شبن سلّو کے ساتھ ایک وفادار بیوی کی طرح چاپانا کل کی طرف چل پڑی۔

وہ ذرا بھی نہیں شرمائی اور نہ جھینپی۔ اور پھر اس روز سے شبن ہی یہ گھر میں پانی دینے لگی۔

ستّو نے شادی کے بعد دوسرے دھندہ کی تلاش شروع کردی۔ اب اس کی گھر والی آگئی تھی۔ وہ ایک سے دو ہو گیا تھا۔ خرچ بڑھ گیا تھا اور بڑھنے والا تھا۔ اور بڑھنا ہی جائے گا۔ شبن گدرا بھی گئی تھی۔ اس کے پاؤں بھاری تھے۔ اس لئے اس نے گاؤں کے نزدیک کے بازار میں دکان داروں کے یہاں دوپہر کا کھانا پہنچانے کا کام شروع کردیا۔ اس کام سے اس کی آمدنی میں قدرے اضافہ ہو گیا۔

اور پھر جس روز اس کی جھونپڑی میں شبن نے ایک لڑکے کو جنم دیا اس کی جھونپڑی اجوائن کے دھوئیں سے بھر گئی تو اس کی خوشی کا ٹھکانہ نہ رہا۔

ستّو کا لڑکا نعمت اللہ جب آٹھ سال کا ہو گیا تو اس وقت تک ستّو کے یہاں تین اولادیں ہو چکی تھیں۔ اس نے نعمت اللہ کو ایک ٹیلر ماسٹر کے یہاں سلائی کا کام پر لگا دیا۔ وہ کاج کاڑھتے کاڑھتے اور بٹن لگاتے لگاتے چار سالوں کے اندر ہی ماشاءاللہ سلائی کا کام بھی کرنے لگا۔

اب نعمت اللہ خیر سے اٹھارہ سال کا ہو گیا تھا تو اس نے ایک روز اپنی بیوی شبن سے کہا "نعمت اللہ کی شادی ....." وہ اتنا ہی کہہ پایا تھا کہ شبن چیخ پڑی۔ "کم بخت کام کرتا ہے اور ایک پیسہ گھر میں نہیں دیتا۔ روزانہ سینما دیکھتا ہے اور جوا کھیلتا ہے۔"

"شادی کے بعد سنبھل جائے گا۔" ستّو نے کہا۔

"شادی کروگے تو کہاں سے کروگے۔ کیا دانت توڑ کر کروگے۔ سوچا بھی ہے کہ گھر میں اناج کا ایک دانہ بھی نہیں ہے۔ بہو آئے گی تو کیا کھائے گی۔" شبن نے منہ بناتے ہوئے کہا۔

"شادی ہو جائے گی تو اسے اپنی گھر والی کے لئے کھانا خوراک تو دینا ہی ہوگا۔"

"اگر اس نے نہیں دیا تو؟"

"دے گا کیسے نہیں۔ جورو آجائے گی تو اس کے ناز نخرے تو سہنے ہی پڑیں گے۔"

سلّو ذرا توقف کے بعد بولا۔

"میرے گھر میں بھی تو کچھ نہ تھا۔ تم آئیں تو اللہ میاں نے کچھ نہ کچھ انتظام کردیا نا۔ اللہ بڑا رزاق ہے۔ وہ سب کچھ انتظام کردے گا۔"

"میں تو بد قسمت تھی کہ میں نے اپنی ساس اور سسر کا سکھ نہیں دیکھا۔ لڑکی کو وہیں بیاہنا چاہئے جہاں اس کی ساس اور سسر ہو۔ جس گھر میں ساس اور سسر نہ ہوں تو وہاں بہو اچھی نہیں لگتی۔ لنڈوری لگتی ہے۔ ساس اور سسر کے چونچلے اور ان کا پیار ..... مجھے، مجھے تو یہ سب کچھ بھی نصیب نہیں ہو سکا۔"

اس لئے تو میں کہتا ہوں کہ اپنی زندگی میں بہو ڈھونڈ لو کہ اسے اپنی ساس اور سسر کا پیار مل سکے۔" سلّو نے شبّن کی باتوں سے فائدہ اٹھاتے ہوئے گویا اس کی نبض پہ انگلی رکھ دی۔ وہ حرف مدّعا جو شبّن کے دل میں چھپا ہوا تھا، اس کا اظہار اس نے کردیا۔ دل کا چور لاکھ چھپاؤ، کم بخت زبان پہ آہی جاتا ہے۔

اور ایک روز نعمت اللہ کی شادی ہوگئی۔

سلّو اور شبّن نے بڑے لاڈ پیار اور تمناؤں کے ساتھ اپنی بہو کو اپنی جھونپڑی میں لایا۔ دو ماہ وہ اس جھونپڑی میں تو چین کے ساتھ رہی۔ پھر اس کے بعد بہو اور ساس کا جھگڑا جو شروع ہوا تو ساس اور سسر کے چونچلے اور پیار غصہ اور نفرت میں تبدیل ہوگئے۔ ایک تو سلّو اور شبّن کی آمدنی کم، دوسرے نعمت اللہ کے سینما دیکھنے اور جوا کھیلنے کی پرانی عادت اپنی جگہ پر، تیسرے شہر سے آئی ہوئی بہو کے نت نئے ناز نخرے۔ ان

سبھوں نے مل کر ان کی زندگی کو اجیرن بنا دیا۔

ایک روز بہو اور ساس میں شدید جھگڑا ہوا۔ وہ پاؤں پٹکتی ہوئی رکشے پر بیٹھ گئی اور یہ کہہ کر اپنے میکے چلی گئی۔ "میں اس گھر میں تھوکنے بھی نہیں آؤں گی۔"

مت آنا نگوڑی۔ تو آئے تو اپنے خصم کو جائے۔" شبن نے بھی خوب جلی کٹی سنائی۔ اور جب وہ اپنے میکے چلی گئی تو شبن نے اپنی جھونپڑی کے دروازے پر دو لوٹا پانی انڈیل دیا کہ پھر وہ کبھی نہ آئے۔ جیسے اس کی جھونپڑی سے اس کی بہو نہیں جا رہی ہو بلکہ کوئی میت اٹھ رہی ہو۔

اور جب شبن کو معلوم ہوا کہ نعمت اللہ اپنی بیوی کے ساتھ الہ آباد چلا گیا ہے جہاں اس نے ایک اچھی ٹیلرنگ کمپنی میں ملازمت کر لی ہے تو اسے ایسا محسوس ہوا کہ وہ احساسات کی دو دھاری تلوار پر چل رہی ہو۔ وہ ایک عجیب اذیت میں مبتلا ہو گئی۔ جب وہ چانپا کل پر پانی بھرنے جاتی تو کوئی عورت اس کے بہو اور بیٹے کی خیریت پوچھتی تو وہ تلملا جاتی۔ اور بولتی۔ "نگوڑی نے مجھ سے میرے بیٹے کو بھی چھڑا دیا۔" پھر وہ چیخیاتی چلی جاتی۔ "میرے لئے نعمت اللہ کیسا۔ وہ تو میرے لئے مر گیا۔ کلمو ہی کو اب خوب کھانے اور گھومنے میں آتا ہو گا۔"

گاؤں کی عورتیں اس کے زخم پر نمک چھڑکتیں۔ "بہو کو ٹھیک سے رکھ نہیں پائی۔ اسی لئے تو بھاگ گئی۔"

وہ ان عورتوں کی باتوں کا جواب کیا دیتی۔ بس دل ہی دل میں مسوس کر رہ جاتی۔ اور جھونپڑی میں چپکے چپکے رو رو کر اپنے دل کی بھڑاس نکال لیتی اس کے سوا اور وہ کر بھی کیا سکتی تھی۔ اس سے روٹھ کر بیٹا اور بہو دونوں دوسرے دیس میں جا کر بس گئے تھے اور اس کی کوئی کھوج خبر نہ لیتے تھے۔ اس کا غم اس کے سوا اور کون جان سکتی تھی۔

صبح میں جب وہ پانی دینے میرے گھر آئی تو اس کے ہاتھ میں ایک لفافہ تھا۔ وہ لفافہ میرے ہاتھ میں تھماتے ہوئے بولی۔ "بابو! یہ خط کل نعمت اللہ کے یہاں سے آیا ہے، ذرا پڑھ کر سُنا دیجئے۔" اس کے لہجہ میں فرطِ مسرت سے تھرتھراہٹ تھی۔ اس کی آنکھیں فخر و انبساط سے چمک رہی تھیں۔ میں نے اس کے چہرے پر لکھی ہوئی وہ تمام تحریریں پڑھ لیں جن میں ممتا کے جذبات تھے۔ نفرت اور غصہ کے عوض ساس اور سسر کے وہ چھپے اور پیار کے نقوش تھے جو ایک بہو لانے کے محرک بنے تھے۔ اور پھر ان تمام طعنہ آمیز سوالات کے جوابات تھے جو اکثر و بیشتر اس سے گاؤں کی بڑی بوڑھیاں کیا کرتی تھیں۔ رسوائیوں، بدنامیوں، بدمزاجیوں، شکوک و شبہات کا حل اور تدارک ایک خط کی شکل میں میرے ہاتھ میں تھا جو واقعی اس کے بیٹے نے الہ آباد سے بھیجا تھا۔ خط میں لکھا تھا کہ:

"والدہ کو نعمت اللہ کا سلام!
معلوم ہو کہ ہم لوگ یہاں ایک دم ٹھیک ٹھاک سے ہیں اور گھر والی کو لڑکا تولد ہوا ہے۔ بس ہو بہو اپنے دادا کی شکل پر ہے۔ ویسا ہی سنولا رنگ، اونچی پیشانی، بڑی بڑی آنکھیں۔"

اتنا ہی پڑھ پایا تھا کہ شبن آنچل پسار کر دعائیں مانگنے لگی اور انجان شہید کے مزار پر چادر چڑھانے کی منت بھی مان لی۔

"مولا! اس لڑکے کی عمر دراز کر۔ میں اسے اپنی آنکھوں سے دیکھ سکوں تب میں انجان شہید کے مزار پر چادر چڑھاؤں گی۔" اس کا رواں رواں خوشی سے ناچنے لگا۔

میں نے کہا۔ "اری شبن! پورا خط تو سُن لے۔"

"ہاں بابو ہاں۔ سناؤ۔"

اور اس نے لکھا ہے کہ "میرا قصور معاف کر دو۔ میں نے آپ لوگوں کا دل دکھایا ہے میں آنا چاہتا ہوں۔ منا کو لے کر آؤں گا۔ کیا تم بگڑو گی؟"

وہ بڑے ہی ملتجی انداز میں بولی۔ "نہیں۔ نہیں۔ میں کبھی نہیں بگڑوں گی۔ میں روکھی سوکھی کھا کر اپنے بال بچوں کا پیٹ پال لوں گی۔ مگر تم سے اور بہو سے نہیں لڑوں گی۔ تم چلے آؤ۔ جلد چلے آؤ۔"

میں نے کہا۔ "تم نے تو اسے قسم دی تھی کہ تو آئے تو اپنے خصم کو چبائے۔"

"بابو کی بات! ارے ماں کی بد دعا کہیں لگتی ہے۔ میں ماں ہوں۔ میرا تو اس سے دودھ کا رشتہ ہے نا۔! میں اپنا دودھ نہیں بخشوں گی تو وہ چین سے مر بھی نہیں سکتا۔ اور بیٹا چین سے نہ مرے اور اللہ اُسے معاف نہ کرے تو کیا کوئی ماں اس عذاب کو برداشت کر سکتی ہے۔ میرے دودھ کا ایک ایک قطرہ اب بھی اس کی رگوں میں خون بن کر دوڑ رہا ہے۔" وہ بہت زیادہ جذباتی بن گئی۔ "اور تب ہی نا اُس نے مجھے خط لکھا ہے۔ وہ مجھے بھولا نہیں ہے، بھولا نہیں ہے۔"

میں اسے صرف دیکھتا ہی رہ گیا۔

●●

تقریر کا جادو

مسز الماس رشید کو آج دنیا ایک موڈرن خاتون کی حیثیت سے جانتی ہے۔ اس کی چرچا شہر کی ہر اونچی اور مہذب سوسائٹی میں ہوا کرتی ہے۔ شہر میں کوئی بھی کلچرل فنکشن ہو، سیاسی یا اجتماعی جلسہ ہو، وہاں مسز الماس رشید کا موجود ہونا لازمی ہے۔ اس کے بغیر کسی اجتماع کا تصور ہی نہیں کیا جاسکتا۔ وہ کلب کی رونق ہے مسٹر رشید جب اپنی بیگم الماس کے ساتھ کسی فنکشن میں پہنچ جاتے ہیں تو وہاں خوشی کی ایک لہر سی دوڑ جاتی ہے اور رنگ محفل ہی بدل جاتا ہے۔ وہ تمام لوگوں کی نگاہوں کی مرکز ہوتی ہے۔ اس کی زندگی آرائش وزیبائش کی دلدادہ ہے۔ جب وہ اپنے صندلی چہرہ پر غازہ اور ہونٹوں پر لپ اسٹک کی تہہ جما کر کسی محفل میں پہنچ جاتی ہے تو اس کے حسن میں چار چاند لگ جاتے ہیں۔ وہ نئے ڈیزائن کی ساڑی اور اسی رنگ کا بلاؤز زیب تن کرتی ہے تو مسٹر رشید اس پر اپنی جان نچھڑ کتے ہی ہیں، دیکھنے والوں کی نگاہیں بھی اس کے جسم وجان کا طواف کرنے لگتی ہیں۔ وہ ہر محفل کی جان اور ہر صحبتِ یاراں کی آن سمجھی جاتی ہے۔

لیکن وہ جب اپنے ماضی کو یاد کرتی ہے تو اس کے دل میں گزرے ہوئے وہ لمحات چٹکیاں سی لینے لگتے ہیں۔ جنھیں اس نے شادی کے قبل، اپنی زندگی کے ۲۲ سالوں تک اپنے گاؤں رام نگر میں بتائے تھے۔ اس کا ماضی اِس نئی

تہذیب اور موڈرن ماحول سے کوسوں دور تھا۔ وہ اس صنعتی شہر کی رنگینیوں اور رنگ رلیوں سے ناآشنا تھی۔ شادی کے بعد ہی وہ اپنے شوہر مسٹر رشید کے نئے ماحول میں اپنے آپ کو ڈھالنے پر مجبور تھی، مجبور کر دی گئی تھی۔ کیوں کہ رخصتی کے وقت جب وہ رام نگر سے مسٹر رشید کے ساتھ دلہن بن کر اس نئے شہر میں آ رہی تھی، تو اس کے والد جمال صاحب نے اس سے کہا تھا:۔۔۔

"شوہر ہی تمہارے لئے سب کچھ ہے۔ وہ تمہارا مجازی خدا ہے۔ اس کی رضی کے بغیر تمہارا کوئی قدم نہ اٹھے، یہ خیال رکھنا۔ تم اپنے اس گاؤں کو، کھیت کھلیان کو، چوپال، پیچھے اور آنگن کو بھول جاؤ۔ مسٹر رشید کے ہر حکم کو ماننا تمہارا فرض ہوگا۔"

اور اس نے اپنے باپ کی یہ بات اپنی گرہ میں باندھ لی اور شہر آ کر وہ اپنے سادہ طرز زندگی کو بھول گئی، جو اسے بہت ہی عزیز تھی۔ وہ اپنے آپ کو اس صنعتی شہر کے ایک بڑے کارخانہ کے مینیجر مسٹر رشید کے مغرب زدہ ماحول اور انگریزی تہذیب میں ڈھالنے کی آہستہ آہستہ کوشش کرنے لگی۔ کیونکہ یہی مسٹر رشید کی خواہش تھی۔ لیکن کبھی کبھار جب اسے اپنے میکے رام نگر کی یاد ستاتی تو وہ تصور ہی تصور میں اپنے آپ کو گاؤں کی کھلی فضا میں پاتی، جہاں وہ تتلیوں کی طرح گاؤں کی الھڑ دوشیزاؤں اور اپنی سہیلیوں کے ساتھ اڑتی رہتی تھی۔

المکس نے اپنے گاؤں میں رہ کر بی۔ اے تک کی تعلیم حاصل کی تھی۔ اسے گاؤں کے جاہل اور غریب معصوم بچوں کو پڑھانے میں بڑی راحت ملتی تھی۔ وہ گھر پہ فرصت کے اوقات میں بچوں کو مفت تعلیم دیتی۔ اس کے پڑھائے ہوئے بچے گاؤں کے ہائی اسکول میں پڑھ رہے تھے۔ بعض بچے تو میٹرک کا امتحان پاس کر کے گاؤں کے

نزدیک کے کالج میں داخل ہو گئے تھے۔ وہ جب اپنے شاگردوں کو اسکول اور کالج جاتے ہوئے دیکھتی تو اس کا انگ انگ خوشی سے ناچ اٹھتا اور اس کی روح سرشاری و سرمستی سے رقص کرنے لگتی۔ وہ نہایت ہی سادہ زندگی بسر کرتی۔ زیادہ تر سادہ ہلکے آسمانی رنگ کی ساڑی اور اسی رنگ کا سادہ سا بلاوز پہنتی۔ گھر میں اپنی ماں کے کام میں ہاتھ بٹاتی۔ بلکہ وہ اپنی ماں کو کوئی کام ہی کرنے نہیں دیتی۔ وہ کھیت پر سے آئے ہوئے دھان کو اوکھلی میں کوٹتی، چھانٹتی، پھٹکتی، مختلف قسم کے اناج کو مٹی کے بنے ہوئے بھنڈار اور "کوٹھی" میں رکھتی۔ اس کے والد جمال صاحب گاؤں کے اچھے خاصے کاشت کار تھے۔ اور گاؤں کے مکھیا بھی تھے۔ عزت و شرافت ان کی ڈیوڑھی کی لونڈی تھی۔ الماس اسی سادہ مگر پروقار ماحول میں پلی، بڑھی۔ اور جب وہ جوان ہوئی تو اس کے والدین کو اس کی شادی کی فکر دامن گیر ہوئی۔ انہوں نے اپنی قریبی رشتہ دار کے اکلوتے لڑکے مسٹر رشید سے اس کی منسوب پختہ کی اور اس کی شادی کر دی۔ مسٹر رشید شہر کے ایک بڑے کارخانہ میں منیجر تھے۔ اونچی تنخواہ پاتے تھے۔ کارخانہ کی طرف سے ہر قسم کی سہولت میسر تھی۔ کافی بڑا بنگلہ تھا۔ جو ہر قسم کے جدید فرنیچر سے آراستہ تھا۔ بنگلہ کے آگے اچھا خاصا لان تھا، جس میں طرح طرح کے پھول اُگے ہوئے تھے۔ جس کی رکھوالی کے لئے کارخانہ کی طرف سے ایک مالی بھی مقرر تھا۔

جب الماس بیاہ کر مسٹر رشید کے ساتھ اس بڑے بنگلہ میں آئی تو اس نے دیکھا کہ یہ دنیا گاؤں سے ایک دم مختلف ہے۔ جہاں موڈرن تہذیب کے نقوش ہر جگہ مرتسم ہیں۔ اس کے باپ نے یوں تو جہیز میں ہر قسم کا سامان دیا تھا۔ ٹی وی، فریج، کولر، گاڈریج کی چھوٹی بڑی الماریاں، اسٹیل اور لکڑی کے نئے طرز کے فرنیچر، الکٹرک کے تمام ضروری سامان۔ لیکن یہ تمام سامان مسٹر رشید کے اس بنگلہ میں پہلے ہی سے موجود تھے۔ جس شخص کو کارخانہ کی طرف سے ہزاروں روپے ماہانہ تنخواہ ملتی ہو، اسے کس چیز کی کمی ہو سکتی ہے۔ مسٹر رشید الماس کو بہت چاہتے تھے۔ وہ چاہتے کہ

لائق بھی تھی۔ دستِ قدرت نے اپنی صناعی کا بہترین مظاہرہ کرکے الماس کا پیکر تراشا تھا۔ اس کی سادگی حسن نے جب یہاں آرائش کے نت نئے طریقوں کو اپنایا تو مسٹر رشید کی نگاہوں میں وہ حسن کی ایک انمول دیوی نظر آئی۔ گاؤں کا حجاب اور نسوانی شرم و حیا کا لبادہ اُڑ گیا اور اس کی جگہ بے حجابی نے لے لی۔ مسٹر رشید جب شام کو کارخانے کے کلب میں جاتے تو وہ الماس کو ضرور لے جاتے۔ وہ اپنے ساتھیوں اور ان کی بیویوں سے اس کا فخریہ تعارف کراتے:۔

"یہ میری مسز ہیں۔ مسز الماس رشید۔"

الماس رشید کو دیکھ کر مسٹر رشید کے ساتھیوں کی بیویاں اس کے حسن اور فیشن سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہیں۔ وہ ان میں الماس کی طرح دمکتی، چمکتی رہی۔ وہ سچ مچ میں ایک ایسا ہیرا تھی جسے مسٹر رشید گاؤں کے کیچڑ سے نکال کر لائے تھے۔

کارخانہ کا یوم تاسیس منایا جا رہا تھا۔ یہ وہ یادگار دن تھا جب کارخانہ کا قیام عمل میں آیا تھا اور جس تاریخی دن کو کارخانہ کی طرف سے بڑے ہی اہتمام سے منایا جاتا۔ اس روز پورے کارخانے کو قمقموں اور طرح طرح کے بجلیوں کے بلب سے منور کیا جاتا۔ کارخانہ کے تمام عملے اور مزدور اس روز نئے کپڑے پہنتے۔ لڑکیاں اپنے بالوں میں پھول اڑستیں۔ بچے خوشی سے ناچتے۔ اس موقع پر کارخانہ کی طرف سے منعقد کئے گئے جلسہ میں مزدوروں کی طرف سے روایتی ناچ اور گانے کے علاوہ طرح طرح کے کلچرل پروگرام ہوتے۔ کارخانہ کے ڈائرکٹر، مینجر، بڑے افسران اور ان کی بیویاں اور بچے اس جلسہ میں ضرور شریک ہوتے۔ رنگ و ترنگ کا عجیب سماں ہوتا۔ جیسے ان کے لئے عید یا ہولی آگئی ہو۔

اس موقع پر مسٹر رشید نے مزدوروں اور حاضرین سے خطاب کرتے ہوئے کہا:۔

"آج ہمارا ملک آزاد ہے اور ہم نے صنعت و حرفت میں کافی ترقی کی ہے اور یہ ترقی مزدوروں کی انتھک محنت اور لگن کا نتیجہ ہے۔ ہمارے قومی رہنماؤں نے ہمیں مل جل کر رہنے اور کام کرنے کی تلقین کی ہے۔ ہم نے اس پر عمل کر کے اپنے کارخانے کی پیداوار میں اضافہ کیا ہے اور ہم ترقی کی طرف بڑھ رہے ہیں۔"

پھر انہوں نے خاص طور پر عورتوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا:۔

"آپ سے بڑی امیدیں وابستہ ہیں۔ آپ کی گود بچوں کی صحیح تربیت کا گہوارہ ہے۔ آپ اپنی زندگی نہایت ہی سادگی سے گزاریں۔ اپنی زندگی میں غیر ضروری اور بے جا اصراف کو راہ نہ دیں۔ سادہ کھائیں، سادہ پہنیں، اور سادہ رہن سہن اپنائیں۔ اسی میں ہماری فلاح ہے۔"

چہار طرف سے داد تحسین کے نعرے بلند ہونے لگے اور تالیاں بجنے لگیں۔ تمام حاضرین مسٹر رشید کی اس تقریر سے کافی متاثر ہوئے۔

ان کی تقریر کا سب سے زیادہ اثر الماس نے لیا۔ وہ جب کار میں بیٹھ کر مسٹر رشید کے ساتھ اپنے بنگلہ میں آئی تو اس نے مسٹر رشید کو اتنی اچھی اور اصلاحی تقریر پر مبارکباد پیش کی۔

اس کے بعد ایسا ہوا کہ کارخانہ کے ایک ضروری کام سے مسٹر رشید کو ایک ہفتہ کے لئے باہر جانا پڑا۔ اور جب وہ ایک ہفتہ کے بعد واپس لوٹے تو وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ ان کے بنگلہ کا نقشہ ہی بدلا ہوا ہے۔ ڈرائنگ روم جو طرح طرح کے سامانوں سے آراستہ تھا، وہ اجڑا ہوا سا نظر آرہا تھا۔ اس کمرے میں نہ تو ٹی وی تھی، نہ فریج، حریری پردے تھے اور نہ قیمتی فرنیچر۔ بلکہ اس کی جگہ

زمین پر دری بچھی ہوئی تھی اور اس پر صاف و شفاف اُجلی چادر پڑی ہوئی تھی۔ ۲ دو چوکیاں بچھا دی گئی تھیں۔ جن پر گدّے لگے ہوئے تھے۔ الماس خود سادگی کا نمونہ بنی مزدوروں کے بچّوں کو پڑھا رہی تھی۔ اس نے ایک سادہ سی بورڈر والی ساڑی پہن رکھی تھی۔ اس کا چہرہ غازہ اور ہونٹ لپ اسٹک سے بے نیاز تھے۔ ہاتھوں میں سونے کی چوڑیوں کے عوض کانچ کی معمولی چوڑیوں نے لی تھی۔ لیکن وہ بے انتہا خوش نظر آرہی تھی۔ ملکوتی مسکراہٹ کی سُرخی اس کے ہونٹوں پر کھیل رہی تھی۔ اس کا چہرہ ایک انجانی خوشی سے چمک رہا تھا۔ جیسے اس کی روح کی سچّی خوشی، طمانیت اس کے انگ انگ سے پھوٹ رہی ہو۔

اس نے مسٹر رشید کو دیکھ کر کہا۔

"آپ نے اپنی اس روز کی تقریر میں سادگی کا درس دیا تھا اور میں نے اُس سادگی کو فوراً قبول کر لیا۔ میں اس سادگی کو پہلے ہی اپنانا چاہتی تھی۔ یہ سادگی تو میرے گاؤں اور بزرگوں سے ورثہ میں ملی تھی۔ میں نے آپ کے کہنے پر اسے ترک کر دیا تھا۔ اب جبکہ آپ کے خیالات میں تبدیلی آئی تو مجھے ایسا محسوس ہوا کہ جیسے آپ نے مجھے میرا کھویا ہوا ماضی لوٹا رہے ہوں۔ میں اس طرزِ زندگی اور سادگی میں بہت ہی سکون پا رہی ہوں۔"

مسٹر رشید کا چہرہ غصّہ سے تمتما رہا تھا۔ وہ خاموشی سے اس کی باتوں کو سُنتے رہے۔

"اور ہاں میں نے سوچا۔ کیوں نہیں اپنے اس وقت کو، جو کلب اور جلسوں میں برباد کیا کرتی تھی، غریب مزدوروں کے بچّوں کو پڑھانے میں صرف کروں۔ سو میں نے ان بچّوں کو پڑھانا بھی شروع کر دیا ہے۔"

"مگر مجھے تمہارا یہ رویہ قطعی پسند نہیں۔ تم نے بدرنگی کا یہ لباس کیوں کا پہن لیا۔ اتنی سادگی۔ توبہ توبہ۔ میں نے وہ تقریر یہ تمہارے لئے نہیں کی تھی۔ وہ تو غریب

مزدوروں کے لئے تھی۔ اور ایسی تقریر کرنا تو ہمارے کارخانہ کا گویا پرانا دستور ہے مجھے تو وہ تقریر میرے سکریٹری نے لکھ کر دی تھی۔ جسے پڑھ کر میں نے جلسہ میں سُنا دیا تھا۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ تم اس کا اثر اتنی جلدی قبول کر لوگی۔" مسٹر رشید برہمی کے انداز میں بولے۔

الماس ہنسی اور بولی :۔

"جب میں خود اس پر عمل نہیں کروں گی تو دوسرے اس پر کہاں تک عمل کریں گے۔ پہلے اس رہن سہن کی سادگی کو خود اپنائیں۔ پھر دوسروں کو کہیں تو اس کا جلد اثر ہوگا۔"

"پگلی! اثر قبول کرنا دوسروں کا کام ہے۔ ہم نے تو وہ باتیں محض یوں ہی کہی تھیں۔ ایسا تو برسوں سے کہا جا رہا ہے۔ تم اتنی سیریس کیوں ہوتی ہو۔"

مسٹر رشید یہ کہہ کر جانے لگے تو کمرے میں بیٹھے ہوئے تمام بچے ان کی قدموں سے لپٹ گئے۔ ان بچوں میں ان کا پانچ سالہ بچہ بھی شامل تھا۔

"بابو بابو، اب ہم پڑھیں گے۔ پڑھ کر آپ کی طرح کارخانہ میں کام کریں گے۔" ان کا ننھا بولا۔ ہاں ابو! ہم سب مل کر پڑھتے ہیں۔ یہ راموہے، یہ شنکر، یہ اوشا، اور یہ رحمو ہے۔ ہا ہا۔" وہ خوشی کے مارے تالیاں بجانے لگا۔

مسٹر رشید کے دل و دماغ کو ان معصوم بچوں کی حرکات و سکنات نے جھنجھوڑ کر رکھ دیا اکثر اوقات بچوں کی معصومیت اور ان کی پاکیزہ ادائیں کٹھور سے کٹھور دل کو بھی موم کی طرح پگھلا دیتی ہیں۔ اور ایسا ہی ہوا۔ دوسری طرف الماس کے اندر کی وہ لافانی خواہش جسے یہاں آکر سُلا دینے کی ناکام کوشش کی تھی، وہ بڑی تیزی کے ساتھ ایک بار پھر جاگ گئی۔

پھر ایک انجانے جذبہ سے سرشار ہو کر مسٹر رشید نے الماس کو گلے لگا لیا۔

●●

احساس کی ریت

اسے اسکول کی ملازمت سے ریٹائر ہوئے ایک سال ہو چکا ہے۔
اب اس کی عمر ۵۹ سال مکمل ہو چکی ہے۔ اس کی عمر گریزاں نے اُس وقت تک کا انتظار نہیں کیا جب ریٹائرمنٹ کی عمر ۵۸ سال سے بڑھا کر ۶۰ سال کر دینے کا اعلان کر دیا گیا۔ اگر اس کے والدین اسکول میں داخلہ دلواتے وقت اس کی عمر میں ایک سال کم لکھا دیتے تو ان کا کیا بگڑتا۔ اس کی زندگی کی خوشیوں کے دن تو بڑھ جاتے، جینے کے حوصلے میں کچھ اضافہ تو ہو جاتا۔ ریٹائرمنٹ کا یہ عذاب، جو وہ ابھی جھیل رہا ہے، اسے جھیلنا تو نہیں پڑتا۔ ایسی بھی شرافت اور سچ کیا، جو زندگی کو اندھیرے کے غار میں ڈھکیل دے۔ اب زندگی اس کی سانسوں کی ڈور کو کب تک اپنے ہاتھوں میں لے کر اس کے وجود، اس کی ذات کی گاڑی کو کھینچتی رہے گی کیا معلوم۔ وہ مزید ایک روز بھی جی سکتا ہے، ایک سال بھی، اور دس سال بھی۔ زمانہ اس سے جینے کا بدلہ کب تک لیتا رہے گا، کہا نہیں جا سکتا۔ ریٹائرمنٹ کا ایک سال اس نے جس کرب اور بے چینی کے عالم میں گزارا ہے، اس کا ہی دل جانتا ہے۔ ریٹائرمنٹ کی مدت میں دو سال کا یہ اضافہ اسے اسکول کی جان بخش فضاؤں سے ہم کنار کر دیتا ہے۔ جن سے وہ اب محروم ہو گیا ہے۔
ہائے وہ کیا دن تھے۔ جب وہ دس بجے اسکول جانے کے لئے تیار ہوتا تھا۔ وہ ایک لمحہ، جو اسکول جانے سے قبل صرف ہوتا تھا، زندگی کا بہترین لمحہ ہوتا تھا۔ اب اس کی یاد دل کو کچوکے لگاتی ہے۔ بیٹی نے اپنے ہاتھوں سے

استری کیے ہوئے فل پینٹ اور شرٹ لا کر دیئے۔ منے نے پپا کا جوتا لا کر دیا۔ بڑے بیٹے نے اس کی سائیکل کی گرد صاف کی۔ بیوی اس کا ناشتہ دان باورچی خانے لے کر یہ کہتی ہوئی دوڑی۔

" آج انڈے کا آملیٹ بھی ہے اور سوجی کا حلوہ بھی۔" پھر ناشتہ دان اس کے ہاتھ میں تھماتے ہوئے بولتی۔

" تم ناشتہ دان میں روزانہ ہی کچھ نہ کچھ چھوڑ دیتے ہو۔ بھر پیٹ کھاتے کیوں نہیں۔" اسے مسکراتے ہوئے رخصت کرتی۔" کھاؤ گے نہیں تو بچوں کو پڑھاؤ گے کیسے۔ دن بھر سر کھپانا پڑے گا۔" اس کی بیوی زیر لب کچھ بڑبڑاتی اور الوداع کہتی۔ بیوی اس کا کتنا خیال رکھتی تھی۔ اس کی مسکراہٹ کتنی روح پرور اور جانفزا ہوتی۔ گویا اس کی مسکراہٹ نے پورے دن کی آنے والی تھکن کے پاؤں تھام لئے ہوں۔ وہ ان ہی مسکراہٹوں کی لذت سے سرشار بچوں کا کلاس لینے میں جٹا رہتا۔ اسے وقت کے گزرنے کا احساس ہی نہیں ہوتا۔ اسکول کی گہما گہمی میں وقت پر لگا کر اتنی تیزی سے گزر جاتا کہ پتہ ہی نہیں چلتا۔ وہ چاہتا کہ وقت ابھی اور تھمے اور تھمے۔ لیکن وقت دبے پاؤں سرکتا رہتا۔ اور جب اسکول کی آخری گھنٹی بجتی تو اس کا دل دھڑکنے لگتا کہ عمر عزیز کا ایک دن اور کٹا۔ ریٹائرمنٹ کی گھڑی کچھ اور نزدیک آ گئی۔ ریٹائرمنٹ کا وقت جیسے جیسے قریب آ رہا تھا اس کے دل کے چراغ کی لو مدھم ہوتی جا رہی تھی۔ وہ بجھا بجھا سا رہتا۔ جیسے ریٹائرمنٹ کی گھڑی نہیں آ رہی ہو۔ موت کی گھڑی نزدیک آ رہی ہو۔ احساس سود و زیاں سے اس پر تھکن اور اضمحلال کی چادر تن جاتی۔ تھکن، اضمحلال، افسردگی یہ چادر نہیں تھی، بلکہ آنے والا وقت اس کے لئے کفن کے تانے بانے بُن رہا تھا۔

اور جب اس کی بیوی کہتی " اب آرام کا وقت آ رہا ہے، پڑھنے پڑھانے سے نجات ملی۔"

تو اس کو ایسا محسوس ہوتا کہ وہ کہہ رہی ہے۔ " موت نزدیک ہے۔ لام قاف بہت چھانٹ لے۔"

پھر اس کے سامنے اس کی بیوی۔ یوگی کی سفید چادر میں گویا نظر آتی۔ اس کے جسم سے کافور کی خوشبو آنے لگتی۔ اس کی چوڑیاں ٹوٹ رہی ہوتیں، اور اس کی مانگ کا سیندور ڈھلتا ہوا دکھائی دیتا۔ اس نے اپنی زندگی میں آرام کرنا سیکھا ہی نہیں۔ آرام کو تو وہ ہمیشہ موت اور جمود کا مترادف سمجھتا رہا۔ اس نے پڑھنے پڑھانے سے اپنی رگوں میں خون کی حرارت پائی۔ وہ جان رہا تھا کہ ریٹائرمنٹ کا ایک وقت متعین ہے لیکن اسے نیند رات بھر نہیں آتی۔

اور ایک روز وہ گھڑی آہی گئی۔ جب ریٹائرمنٹ کا وقت آگیا۔

ریٹائرمنٹ کے بعد آہستہ آہستہ اسے ایسا محسوس ہوا کہ گھر کا نقشہ بدل رہا ہے۔ گھر کے در و دیوار کچھ اجنبی سے لگ رہے ہیں۔ وہی در ہے، وہی دیواریں ہیں، مکان کی وہی چھت ہے، وہی کمروں کی کھڑکیاں اور روشندانیں ہیں، لیکن اب جیسے یہ سب اسے پہچان نہیں رہے ہیں۔ اب ان کھڑکیوں میں سورج طلوع ہوتا ہے تو پھیکا پھیکا سا۔ وہ اس کا سہانا پن کہاں چلا گیا۔ اس کی وہ تمازت کہاں کھو گئی جو جاڑے میں اسے گرمی پہنچاتی تھی۔ وہ ہنگام صبح گاہی، وہ غسل کے لئے گرم پانی کا انتظام، وہ بڑتی، سب کیا ہوئے۔ ان معمولات زندگی میں کمی کیوں آگئی۔ وہ اب کس سے پوچھے کہ اس کی بیوی بھی باتوں باتوں میں اسے جھڑک دیتی ہے۔ وہ اب پہلی سی چاہت، لگاوٹ، قربت نہیں پاتا جیسے کسی مریض کا تیماردار اس وقت اس کے علاج معالجہ میں کمی کر دیتا ہے جب اسے معلوم ہو جاتا ہے کہ اس کا مریض ایک دو دن کا مہمان ہے تو کیا اب اس کے آخری دن آگئے ہیں، زندگی اسے کس موڑ پر لے آئی ہے۔

اب وہ ہے۔ اس کی تنہائی ہے اور اس کی خود کلامی۔ وہ اپنے منتشر

خیالوں کی بھیڑ میں اپنے آپ کو تنہا نہیں پاتا۔ وہ اپنے مکان کی چہار دیواری میں مقید ہے۔ وہ دن بھر مکان کے کمرے، سائبان، کھلی ہوئی چھت کا طواف کرتا رہتا ہے کہ وقت کٹے اور جلد کٹے۔ اب یہ دن، یہ آفتاب ڈھلنے کو نام نہیں لیتا یہ بہار جیسی رات جلد ختم کیوں نہیں ہوتی۔ سورج جلد طلوع کیوں نہیں ہوتا۔ کیا وقت کے نظام میں بھی تبدیلی آگئی ہے۔ کیا اس کی ریٹائرمنٹ کی سخت کوشی اور زندگی کے منحوس سائے ان پر بھی پڑ گئے؟ کہ نظام قدرت اپنے محور پر تھم سا گیا ہے۔

آج جاڑے کی لمبی رات ویسی ہی سفاک اور ظالم تھی کہ وہ اپنے کمرے میں تنہائی کا درد سہہ رہا تھا۔ اور وہ اپنے بستر پر، احساس کی ریت پر بے چینی سے کروٹیں بدل رہا تھا اور نیند روٹھی ہوئی تھی۔

آج بجلی بھی غائب تھی اور کمرے میں اندھیرا تھا۔ اس نے دیکھا کہ اس کے آبائی گاؤں کا شیام اس کے سامنے بیٹھا ہے۔ وہی چہرہ مہرہ، وہی الجھے ہوئے گرد آلود بال، وہی عقابی اور چمکتی ہوئی آنکھیں۔ وہی موٹا کھادی کا ہاف آستین کا کرتا، گھٹنوں سے اوپر اٹھی ہوئی دھوتی، پاؤں میں سنگینئ وقت کے جگہ جگہ پڑے ہوئے شگاف۔ وہ اس سے زیادہ بوڑھا دکھائی نہیں دے رہا تھا جیسے اس کے لئے وقت رک گیا ہو۔

"چوکی پر بیٹھ جاؤ۔ آج بہت دنوں کے بعد تمہیں دیکھا ہے۔ میں تمہیں اچھی طرح پہچانتا ہوں شیاما! تم تو رامو چاچا کے بیٹے ہو نا۔ وہی رامو چاچا، جو ہمارے کھیت جوتا کرتے تھے اور جو مجھے بچپن میں اپنی گود میں کھلایا کرتے تھے۔ بھلا میں تمہیں کیسے بھول سکتا ہوں۔ یوں تو وقت نے بچپن اور گاؤں کی تمام پرانی یادوں کی کتاب پر گرد کی ایک موٹی تہہ جما دی ہے۔ لیکن وقت کی یہ گرد اس وقت جھڑ رہی ہے۔ اس کا ایک ایک ورق مجھے یاد آ رہا ہے۔

مجھے وہ اسکول بھی یاد آرہا ہے، جہاں بڑے ہونے پر ہم اور تم دونوں پڑھنے جایا کرتے تھے۔ اب تو وہ پرائمری اسکول ہائی اسکول میں تبدیل ہو گیا ہوگا۔ وہ لالہ گردھاری پرشاد اب زندہ ہیں یا نہیں، جو ہم لوگوں کو اردو اور ہندی پڑھایا کرتے تھے۔

"اچھا یہ بتاؤ کہ وہ تمہاری بہن شکنتلا کیسی ہیں! جو ہم دونوں سے تین سال بڑی تھیں۔ وہ کِھساری کا ساگ اور مِلاون کی روٹی بنا کر کھلاتی تھیں۔ کیا مزہ آتا تھا کھانے میں۔ وہ ہم سے زیادہ بوڑھی ہو گئی ہوں گی۔ تم کچھ جواب کیوں نہیں دیتے، میں سمجھ گیا وہ پرلوک سدھار گئی ہوں گی۔ دنیا کا دکھ سہنے کے لئے اتنی طویل مدت تک جینا آسان نہیں۔ اچھا ہوا وہ مر گئیں۔ نہیں تو غم سہتے سہتے پِتّا پانی ہو جاتا۔ وہ زمانہ کچھ اور تھا اور یہ زمانہ کچھ اور ہے۔ اس دور نے تو بہت لوگوں کے دلوں پر اتنے زخم لگائے ہیں کہ ان کو گننا آسان نہیں۔ مجھے ابھی تک برگد کے پیڑ کے نیچے بنا ہوا وہ چبوترا یاد ہے جس پر سرِ شام گرمیوں کے دنوں میں گاؤں کے لوگ جمع ہوتے تھے رحیم ماموں، گھنشیام داس، کلو شاہ، سرجو پاٹھک، فتح سنگھ مکھیا۔ وہ لوگ آج بھی اس چبوترے پر بیٹھ کر اپنی محفلیں جمایا کرتے ہیں یا نہیں۔ گاؤں کے چھوٹے موٹے جھگڑے آج بھی اسی طرح نپٹائے جاتے ہوں گے اور وہی میل ملاپ کا ماحول ہوگا۔ ہوگا نا۔"

"میں دیکھ رہا ہوں کہ تم کچھ کہنا چاہتے ہو مگر کچھ نہیں کہہ پاتے۔ ٹھیک ہی ہے۔ خاموش رہو۔ بعض باتیں اگر کھل کر کہی جائیں تو درد بڑھنے کا خدشہ ہوتا ہے اور خاموشی میں کی جائیں تو بھرم رہ جاتا ہے۔" سوشیا ما خاموش تھا۔

گاؤں میں دیوالی اور ہولی تو اب بھی آتی ہوگی۔ اب بھی لوگ اسی طرح مل جل کر ہندو مسلمان، چھوٹے بڑے خوشیاں مناتے ہوں گے۔ اور تم اب بھی محرم میں پیک لگتے ہوگے۔ یاد ہے نا تمہیں کہ تمہاری دادی نے تمہاری بیماری کے

موقع پر منّت مانگی تھی کہ میرا شیاما اچھا ہو جائے گا تو امام صاحب کا پیک لگے گا۔

اور گاؤں کے کنارے اس بڑے کنویں کا کیا حال ہے۔ پنگھٹ پر آج بھی گاؤں کی عورتیں پانی بھرنے کو اسی طرح آتی ہوں گی اور کنواریاں اسی طرح اپنے خوابوں کی کٹیا میں کسی بانکے، البیلے نوجوان کے تصور سے چراغ روشن کرتی ہوں گی۔ اس کے پانی سے اب بھی وہی گلاب اور کیوڑے کی خوشبو آتی ہوگی۔"

اس نے محسوس کیا کہ راموچاچا کے بیٹے شیاما نے ایک آہ سرد بھری۔ اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کے قطرے گرنے لگے۔ اس کی زبان سے ایک لفظ بھی نہیں نکلا۔ اس کے پاس کہنے کے لئے کچھ نہ تھا۔ وہ سفر پر تھا، سفر سے آرہا تھا لیکن اس کے پاس گردِ سفر کے سوا کچھ بھی نہ تھا۔

معاً کمرے میں بجلی آگئی۔ اب اس کے سامنے شیاما نہ تھا۔ اب اس سے اس کی زبانِ خود کلامی اور چشمِ خود آگہی بھی چھین لی گئی۔

●●

گلاب پھر مہک اُٹھا

دامودر پور کے رجسٹرار صاحب تیسری بار اس کے مکان پر آئے تھے۔
ان کے ساتھ دو صاحب اور تھے۔ ان میں ایک نوجوان تھا جو اچھا خاصا
سوٹ میں ملبوس تھا اور جس کی عمر لگ بھگ ۳۵ سال معلوم ہوتی تھی۔ دوسرا
شخص ادھیڑ عمر کا تھا جو سلک کے بادامی رنگ کا کرتا اور دھوتی پہنے ہوئے تھا۔
اور جس کی گردن میں سونے کی ایک زنجیر پڑی ہوئی تھی۔ جن کی وجہ سے اس ادھیڑ عمر
شخص کی شخصیت نمایاں تھی۔ اور جن سے اس کی وجاہت اور ایک خاص قسم کی طمانیت
ٹپک رہی تھی۔ رجسٹرار صاحب کو تو وہ پہچانتا تھا کیونکہ اس سے قبل وہ دو بار
اپنی لڑکی انیتا کماری کی شادی کا پیغام لے کر آ چکے تھے۔ وہ اپنی اکلوتی بیٹی کی شادی
اس سے کرنا چاہتے تھے۔ وہ اس بار آئے تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس سے
ان کی لڑکی کا رشتہ اب پختہ ہونے ہی والا ہے۔ ان کے چہرے پر اُمید اور آشا
کی دیوی نے جیسے اپنی زلفیں بکھیر دی تھیں۔ ان کے ہاتھ میں مٹھائی کی بھری ہوئی
ایک بڑی سی ٹوکری بھی لٹک رہی تھی۔

اس کی شادی کی باتیں اس سے بظاہر چھپا کر کی جا رہی تھیں لیکن وہ سب
کچھ جانتا تھا۔ وہ بچہ تو تھا نہیں۔ اچھا خاصا ۲۵ سال کا گبرو، جوان تھا۔
اور ہر محکمہ میں کلرک تھا۔ بھگوان نے اسے عقل دی تھی۔ وہ چاہتا تو اپنی شادی
کی بات چیت میں مداخلت کر سکتا تھا۔ لیکن اس کے خاندان میں ایک روایت
چلی آ رہی تھی کہ اپنے بچوں کی شادی کے موقع پر ان کے والدین نے کبھی بھی ان سے

ان کی مرضی جاننے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی۔ بس جہاں جی چاہا رشتہ کر دیا۔ وہ دیکھتا آیا تھا کہ اس کے خاندان میں اس کے چاچاؤں، پھوپھاؤں اور خالوؤں نے کس طرح اپنے لاڈلوں کی شادیاں کی تھیں۔ اس کے خاندان کے نوجوانوں نے اس سلسلے میں مُنہ کھولنے کی جرأت نہیں کی۔ اور وہ بھیڑ، بکریوں کی طرح اِدھر سے اُدھر کھونٹوں پر باندھ دیئے گئے۔ ان کو ممیانے کی بھی اجازت نہیں تھی۔ وہ خود اس خاندانی پرمپرا کو توڑنا نہیں چاہتا تھا۔ ماں باپ تھوڑے ہی چاہتے ہیں کہ ان کے لڑکوں کی شادیاں کسی غلط جگہ ہو جائیں۔ اور پھر گاؤں کے لوگ کیا کہیں گے کہ چودھری روپ نرائن کے لڑکے نے اپنی شادی کے وقت زبان کھول دی۔ گویا ان کے مُنہ میں ان کی اپنی زبانیں نہیں تھیں۔ بلکہ یہ زبانیں ان کے مُنہ میں برسوں سے چلی آ رہی وراثت کے طور پر ڈال دی گئی تھیں جن کی اپنی ایک معمولی خواہش کے اظہار کو بھی بدتمیزی پر محمول کیا جاتا ہے۔ سو وہ خاموش تھا۔ اور حالات کو بھانپ رہا تھا۔ لیکن اپنے پتاجی چودھری روپ نرائن سے یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ لڑکی کی صرف خوب صورتی اور اس کے حسنِ سیرت کو دیکھ کر ہی شادی کی بات پکی کریں۔

آج بھی یہی ہوا۔ جو ہوتا آیا تھا۔

وہ باہر والے دالان سے اُٹھ کر بغل والے کمرے میں چلا آیا۔ جس کا اُتری حصہ اس میدان میں ملتا تھا جہاں دھان کے پیال کے پونج لگے ہوئے تھے اور دکھنی حصہ اس گؤشالہ میں کھلتا تھا جہاں کھیت جوتنے والے بیل اور دودھ دینے والی گائیں اور بھینسیں جگالی کر رہی تھیں۔ آنے والے مہمان دالان میں بچھی ہوئی چوکیوں کی شطرنجیوں پر بیٹھ گئے۔ چائے پانی ہونے کے بعد اس کے پتاجی چودھری روپ نرائن اور آنے والے مہمانوں کے درمیان بات چیت ہونے لگی۔

"مجھے آپ کی ہر بات منظور ہے۔" رجسٹرار صاحب نے کہا۔

"۸۰ ہزار روپے بطور تلک کی شرط بھی منظور ہے" ادھیڑ عمر کا مرد بولا۔
"اس کے علاوہ جہیز میں بہت ساری قیمتی چیزیں بھی دی جائیں گی۔ ہماری تو یہی ایک بہن ہے۔ آپ چنتا نہ کریں۔ آپ کی ہر خواہش پوری کر دی جائے گی۔" کوٹ والا نوجوان بولا۔

اور وہ کمرے میں بیٹھا سب کچھ سنتا رہا۔ وہ یہ بات جاننے کے لئے ضرور مشتاق تھا کہ اس کے پتا جی اس کی ہونے والی کنیا کے بارے میں پوچھیں گے۔ وہ کیسی ہے؟ اس کے چہرے کا رنگ کیسا ہے؟ وہ کس شکل و شباہت کی ہے؟ اس کا قد کتنا ہے؟ اور پھر وہ گھر گرہستی کے ہنر سے خوب واقف ہے یا نہیں۔؟ لیکن اس کے پتا جی نے یہ سب کچھ نہیں پوچھا۔ بس تلک اور جہیز کی فہرست دیکھ کر اس کی شادی کی بات پکی کر دی۔ گاؤں کے پنڈت جی کو بلوا کر لگن پتر ادھلوایا اور پھاگن کے مہینہ میں بارات کی تاریخ مقرر کر دی۔ رجسٹرار صاحب کی لڑکی ہے۔ اچھی ہی ہوگی۔ زیادہ پوچھ تاچھ کی کیا ضرورت ہے۔ اور پھر لڑکی کے بارے میں زیادہ چھیلن کرنا، اچھا نہیں معلوم ہوتا۔

اور وہ بیاہ دیا گیا۔

اسے جس بات کا دھڑکا لگا ہوا تھا، وہی ہوا۔ یعنی اس کا گھر تو قیمتی سامانوں سے بھر گیا۔ اور تلک کے اسی ہزار روپے بھی اس کے پتا جی نے اپنی گانٹھ میں باندھ لئے لیکن اس کی کنیا جو آئی تو وہ نہایت ہی بدصورت تھی۔ سندرتا اس سے کوسوں دور تھی۔ اس نے ایک حسین اور مدھ ماتی پتنی کو حاصل کرنے کا جو خواب دیکھا تھا، وہ پورا نہیں ہوا۔ اس نے سوچا تھا کہ وہ ایک آئیڈیل لڑکی سے شادی کرے گا، جو گاؤں میں ہر لحاظ سے ایک آدرش لڑکی ہوگی۔ لیکن وہ لڑکی ایک سپنا بن کر رہ گئی۔ وہ اپنے کسی ساتھی کی بیوی کو اپنے ذوق حسن کی کسوٹی پر پرکھتا، اور اس میں ذرا سی بھی جھول پاتا تو اس کی ہنسی اڑائے بغیر نہ رہتا۔ کسی کی بیوی اگر

کالی اور موٹی ہوتی تو وہ پھبتی کستا۔

"ارے یار! تمہاری بیوی ہے یا للو بھتو کی بھینس۔ کالی کلوٹی اور موٹی۔ بھینس اور لڑکی میں تو کچھ فرق ہونا ہی چاہئے۔"

یا پھر کسی کی بیوی ناٹی اور پست قد کی ہوتی تو وہ کہتا۔

"ارے تمہاری بیوی اتنی ناٹی ہے کہ توبہ بھلی۔ اتنی کم عمر میں ہی بھُس کر رہ گئی ہے آئندہ بھگوان جانے۔"

اگر کسی کی بیوی لانبی ہوتی تو بھی وہ کوئی جملہ کسے بغیر نہیں رہتا۔

"تمہیں تو سیڑھی لگانی پڑے گی۔"

وہ زیادہ تر اپنے دوستوں کی بیویوں کا مذاق اڑاتا اور اب وہ خود دوستوں کے درمیان مذاق بن کر رہ گیا تھا۔ وہ اپنی انیتا کو اپنے ساتھ شہر لے جانے میں اپنی سُبکی سمجھتا تھا۔ جو اس کے گاؤں سے فقط دو میل پر واقع تھا۔ انیتا اس کے ساتھ اسکوٹر پر سوار ہو کر شہر جانے کے لئے ضد کرتی لیکن وہ کوئی نہ کوئی بہانہ کر کے اسے شہر نہیں لے جاتا۔ وہ اس سے صاف صاف کیسے کہتا کہ لوگ شہر میں اس کی بدصورتی کا مذاق اڑائیں گے۔

ایک بار اسے شہر لے جانا پڑا۔ اس کے آفس کے بڑے بابو کی لڑکی کی شادی تھی۔ وہ اسے لے کر اس تقریب میں گیا۔ انیتا گہنوں سے لدی بھری تھی۔ انگلیوں کے پور پور میں سونے کے دستانے جڑے ہوئے تھے۔ ماتھے پر بہت ہی بڑا خوب صورت سا مانگ ٹیکا، کانوں میں جھمکے، گلے میں سونے کا گلوبند اور اس پر جگ مگ، جگ مگ کرتا ہوا چندرہار، ہاتھوں میں سونے کی چوڑیاں اور کنگن۔ کون سا ایسا گہنا نہیں تھا جو وہ پہن کر نہیں گئی تھی۔ لیکن یہ زیور اور یہ گہنے اس کی بدصورتی کی پردہ پوشی نہ کر سکے۔ بلکہ ان گہنوں کی وجہ سے اس کی شخصیت اور مضحکہ خیز بن گئی۔ شادی کے منڈپ میں تمام لڑکیوں کی نگاہیں اس کے زیور پر تھیں اور اس کی

بدہئیتی کو دیکھ کر آپس میں ہنس رہی تھیں۔ یہ زیور اس کے بدنما چہرہ پر ایسے لگ رہے تھے جیسے کالے گجرے کے حلوے پر کسی نے سونے اور چاندی کے طبق چڑھا دیئے ہوں۔ انیتا ان لڑکیوں کی نگاہوں کی چبھن سہہ نہ سکی۔ اسے ایسا محسوس ہوا کہ وہ ان زیوروں اور بنارسی ساڑی اور زرق برق لباس میں ملبوس ہونے کے باوجود ننگی ہے۔ وہ لڑکی کی رخصتی کے فوراً بعد ہی گھر چلی آئی۔ اس کا من اداس تھا۔

انیتا اس سے روہانسی ہو کر بولی۔ "اب تم مجھے کسی دوست یا کسی رشتہ دار کی شادی میں نہ لے جانا۔"

"آخر کیا ہوا؟" اس نے گھبرا کر پوچھا۔

"بڑے بابو کے یہاں جا کر میں تو ایک مذاق بن گئی۔ چڑیلیں مجھے دیکھ کر ہنس رہی تھیں۔"

"ان کمبختنیوں کو گولی مارو۔ میں تو تمہیں پیار کرتا ہوں۔ جی سے چاہتا ہوں۔" وہ یہ بول کر، جان بوجھ کر اپنے آپ کو دھوکا دے رہا تھا۔ جھوٹ بول رہا تھا۔

انیتا کو اس روز شدید احساس ہوا کہ اس کے یہ تمام گہنے اس کی بدصورتی کو بھی نہیں چھپا سکتے۔ بڑے بابو کے یہاں اس کی جو جگ ہنسائی ہوئی تو اس کی وجہ سے اس کے اندر کے "بڑاپن" کا احساس اور شدید ہو گیا۔ اور ردعمل کے طور پر عورت کی انا "ضد اور حسد کی ملی جلی کیفیات سے دوچار ہو گئی۔ محبت نے نفرت کی جگہ لے لی اور اسے ہر خوب صورت چیز سے چڑ سی ہو گئی۔ وہ گاؤں کی خوب صورت سی لڑکیوں سے جلنے لگی۔ وہ انہیں اپنی جوتیوں کی نوک پر رکھتی۔ اس نے اپنے مکان کے گھیرے کے اندر آنگن میں لگے ہوئے خوب صورت پھولوں کے پودوں کو آن واحد میں کاٹ کر رکھ دیا۔ اب اس کے آنگن میں کوئی گلاب کا پھول نہیں مہک سکتا تھا، کوئی گیندا، چنبیلی اور جوہی کی کلی نہیں کھل سکتی تھی۔

ایک روز انیتا کے کم سن چچیرے دیور نے اپنے بغل والے مکان سے آکر

اس کے آنگن میں ایک گلاب کا پودا لگا دیا تو اس نے اپنے شوہر سے شکایت کی۔ "میں ہمیشہ کہتی ہوں کہ میرے آنگن میں کسی قسم کے پھول کا پودا نہ لگایا جائے۔ آج چندر نے گلاب کا پودا لگا دیا۔"

"آخر چندر نے کوئی برا کام تو نہیں کیا۔ اس نے پھول کا پودا ہی تو لگایا تھا۔" اس نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

"آخر وہ پھول کا پودا کیوں لگائے گا جب میں نہیں چاہتی۔"

"آخر تم کیوں نہیں چاہتیں۔ گلاب کتنا حسین پھول ہوتا ہے۔ اس کی لال پنکھڑیوں کو دیکھ کر آنکھوں میں ٹھنڈک پیدا ہوتی ہے۔ جب صبح ہوا چلتی ہے تو پھول کی ڈالیاں کس طرح جھوم جھوم کر آپس میں گلے ملتی ہیں۔ تم نے کبھی باغ میں جا کر پھولوں کا منظر تو دیکھا ہی نہیں۔"

"میں دیکھنا بھی نہیں چاہتی۔ میں اب تم کو کس طرح بتاؤں کہ پھول کی پنکھڑیاں میری آنکھوں کے پپوٹوں میں کانٹے بن کر چبھتی ہیں۔ ان کی خوشبو سے میرے سر میں درد ہونے لگتا ہے۔"

اب وہ اینیتا کی خوب صورتی، خوشبو اور خوش ادائی سے نفرت کا کیا جواب دے۔ گاؤں کی کوئی خوب صورت لڑکی اگر غلطی سے اس کے گھر آجاتی تو وہ اسے مارنے کے لئے دوڑتی اور چیختی۔ "نگوڑی! کیا مجھے چڑھانے کے لئے آتی ہو۔ بھاگ جاؤ۔ میری نظروں سے دور ہو جاؤ______"

اینیتا کی بدمزاجی سے وہ تنگ آچکا تھا۔ اینیتا کے اندر احساس برتری اُبھر کر، طرح طرح کا روپ دھار کر، اس کے وجود کو اور زیادہ گھائل کرنے لگا۔

"میں کسی ننگے بھوکے خاندان کی لڑکی نہیں ہوں۔ رجسٹرار کی بیٹی ہوں۔ ہمارے باپ نے ۲۰ ہزار روپے تلک میں چڑھائے ہیں۔"

وہ اینیتا کے تیکھے جملوں کو خاموشی سے، ایک وفادار شوہر کی طرح برداشت

کرتا رہا۔ وہ اپنے پتا جی کے ڈر سے بھی کچھ نہیں بولتا۔ وہ اب زیادہ بوڑھے بھی ہو گئے تھے۔ طرح طرح کی بیماریوں نے انہیں دبوچ رکھا تھا۔ وہ سوچتا کہ اب پتا جی چند روز کے مہمان ہیں۔ خواہ مخواہ ان کا دل دُکھا کر، ہائے، سراپ کیوں لیا جائے۔ اور واقعی اس کے پتا جی، چودھری روپ نرائن چند ہفتوں کے بعد ہی پرلوک سدھار گئے۔ ماں پہلے ہی مر چکی تھی۔ اب وہ اس بڑے گھر میں اکیلا تھا۔ جو اس کے پتا جی کو اس کے چچا چاؤں سے بٹوارے میں ملا تھا۔

جب وہ گھر میں آفس سے لوٹتا تو گھر اسے کھانے کو دوڑتا۔ اَنیتا بات بات پر اس سے جھگڑتی رہتی۔ وہ روز کی اس چخ چخ اور کھچ کھچ سے گھبرا گیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ انیتا کی اس نفرت کی آگ کو کیسے ٹھنڈا کرے۔ اس گھر نا کے چٹیل میدان پر پیار اور محبت کے پھول کیسے کھلائے؟

اس نے ایک روز اپنے دل میں فیصلہ کر لیا کہ وہ دوسری شادی کرلے گا۔

اسے آفس کے کام سے چار روز کے لئے باہر جانا پڑا۔ چار روز کے بعد جب وہ گھر لوٹا تو اس کے ساتھ ایک نہایت ہی حسین و جمیل لڑکی تھی۔ جو اس کے خوابوں کی جیتی جاگتی تعبیر تھی۔ وہ گھر میں داخل ہوتے ہوئے بولا۔

"انیتا! دیکھو کون آئی ہے۔ میں نے ایک مندر میں بالی کی مانگ میں سیندور بھرا ہے۔ اور بغیر تلک اور جہیز کے اس سے ویواہ کیا ہے۔ دیکھو دیکھو کیسی سُندر دکھائی پڑتی ہے۔"

اور پھر بالی نے جھک کر انیتا کو پرنام کیا۔ اور اس کے چرن چھوئے۔ انیتا نے دیکھا کہ واقعی ایک سندرتا کی دیوی اس کے سامنے کھڑی ہے۔ وہ تھوڑی دیر کے لئے مبہوت ہو گئی۔ لیکن اسے یہ احساس ہوا کہ بالی اس کی سوکن بن کر آئی ہے اور حسن کی دولت سے آراستہ ہو کر آئی ہے۔ تو وہ اپنے اوپر قابو نہ پا سکی اور بولی۔

"میں اسے اس گھر میں نہیں رہنے دوں گی۔ میں نے جس طرح آنگن کے پھولوں کی

پنکھڑیاں نوچ کر پھینک دی ہیں۔ ٹھیک، اسی طرح اس کے سر کا ایک ایک بال نوچ کر پھینک دوں گی۔"

وہ ہنسا اور سمجھاتے ہوئے بولا "تمہاری یہ سوکن نہیں ہے۔ بلکہ یہ تو تمہارا دوسرا روپ ہے۔ نہایت ہی حسین، جمیل اور لطیف۔ تم اس حسین روپ کو اپنے پیکر میں اُتار لو۔ انیتا! پھر دیکھو تمہارے جیون میں سکھ کی لہریں کس طرح بہتی ہیں۔"

انیتا بولی۔ "تمہیں اس سے شادی کرنی تھی تو تم نے مجھ سے شادی کیوں رچائی۔ تم کہتے تو اپنے میکے جا کر اور بھی تمہاری کمیوں کو پورا کر دیتی۔"

"میرے گھر میں کوئی کمی نہیں ہے انیتا۔ تم غلط سمجھ رہی ہو۔ کمی ہے تو صرف تمہاری ذات میں ہے۔ میں نے اس کمی کو پورا کر لیا ہے۔ تم بالی کی ذات کو اپنی ذات میں سما لو۔ ہم آہنگ کر لو۔ اور تب دیکھو کہ کس طرح تمہاری ذات اور تمہارا وجود اس سکھ کے لئے کتنا جہان بنتا ہے۔ تمہارے پاس جو ہے وہ بالی کے پاس نہیں ہے۔ اور بالی کے پاس جو ہے وہ تمہارے پاس نہیں ہے۔"

مجھے میکے پہنچا دو۔ اور ابھی پہنچا دو۔" انیتا غصّہ سے لرز رہی تھی۔

وہ اسے میکہ پہنچانا ہی چاہتا تھا۔ انیتا کے پاؤں بھاری تھے اور دن چڑھ گئے تھے۔ گاؤں میں کوئی ایسا نرسنگ ہوم بھی نہ تھا جہاں اسے ولادت کے وقت بھرتی کیا جا سکتا تھا۔ اس کے میکے شہر میں اس قسم کے کئی نرسنگ ہوم تھے۔ لیڈی ڈاکٹر اور نرسوں کی کمی نہ تھی۔ اس نے انیتا کو میکہ پہنچانے ہی میں اپنی خیریت سمجھی اور اس نے اسے اس کے میکہ پہنچا دیا۔

چھ ماہ کے بعد انیتا کے بھائی نے اسے اس بات کی خوش خبری دی کہ بھگوان نے اسے ایک چاند سی بچی دی ہے۔ خط میں انیتا کے گونا کی بات بھی کہی گئی تھی۔

اس نے اس خط کے جواب میں اپنے سسر اور سالے کو لکھا کہ تین چار ماہ کے بعد وہ انیتا کو نے آئے گا۔ یا وہ خود اپنے بھائی کے ساتھ دامودر پور سے چلی آئے گی۔

ٹھیک چار ماہ کے بعد انیتا اپنے بھائی کے ساتھ اپنی سسرال چلی آئی۔

جب وہ آئی تو اس نے دیکھا کہ انیتا کی مانگ میں چٹکی بھر سیندور پڑا ہوا ہے۔ اور حسن و شباب کا ایک دل کش پر تو اس کے مکھڑے پر سایہ فگن ہے۔ اس کے مکھڑے پر ممتا کا ایک نور تھا اور محبت اور پیار کا عکس جمیل۔ جس کا کوئی نام نہیں دیا جا سکتا بعض عورتوں کے رخسار کی رنگت سفید اور دودھ جیسی ہوتی ہے لیکن انہیں حسینوں میں شمار نہیں کیا جا سکتا اور بعض چہرے سیاہی مائل ہوتے ہیں، جمنیا رنگ، جس پر حسن و شباب کی ملاحت قربان جاتی ہے۔ اسے یہاں پر وہ اور صرف وہ محسوس کر کے دل ہی دل میں پھولے نہیں سما رہا تھا۔ انیتا کے ہونٹوں پر بھی گلاب کی لال پنکھڑیوں کی سرخی مچل رہی تھی۔ وہ کبھی اپنی خوب صورت سی گڑیا کو دیکھتی اور کبھی اپنی سوکن بالی کو۔

اس نے اپنی بچی کو بالی کی گود میں دیتے ہوئے کہا "میری گڑیا ٹھیک تمہاری طرح سُندر ہے۔" اور اس نے اس کے گالوں پر چٹکی بھری۔ جس سے بالی کا رخسار لعل بدخشاں کی طرح دہک اٹھا۔

اس کے شوہر نے اپنی بچی کو گود میں لے لیا۔ اور انیتا اور بالی دونوں گلے مل کر بہنوں کی طرح پہلے تو خوب روئیں اور پھر دونوں آنگن میں چلی آئیں۔ جہاں کئی قسم کے پھول لہلہا رہے تھے۔ بیلا، جوہی، موتیا اور گلاب — انیتا نے گلاب کا ایک پھول توڑ کر بالی کے جوڑے میں اڑس دیا۔

●●

وِش بھی اَمرِت بھی

یہ رگھوناتھ پور کی کہانی ہے، جہاں وہ اپنے گاؤں شنکر نگر سے بیاہ کر رام بھروسے کے گھر آئی تھی۔ رگھوناتھ پور اس جگہ واقع تھا جہاں چاروں اور سے اسے چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں نے اپنی باہنوں میں لے رکھا تھا اور جس کے بیچ ایک ندی بہتی تھی اور جو رگھوناتھ پور کے قدموں کو چھوتی ہوئی دور دور تک چلی جاتی تھی۔ جب برسات میں گھٹائیں اُمڈتیں اور بارش کا تیور ذرا بگڑ جاتا تو یہ ندی اپنی سبک خرامی کھو دیتی اور اس میں بلا کی تیزی اور تندی آجاتی۔ بسا اوقات یہ رگھوناتھ پور میں بسے ہوئے کچے پکے مکانات اور چھوٹے چھوٹے پھوس اور مٹی کے بنے ہوئے گھروں میں قیامت ڈھاتی۔ لیکن جب آئی ہوئی ندی ختم جاتی اور پانی اُتر جاتا تو یہی ندی ایک مست خرام ناز حسینہ کی طرح سبھوں کو پرنام کرتی ہوئی دکھائی دیتی جیسے وہ قدرت کی قہر ساما نیوں کے لئے چھما مانگ رہی ہو۔

یہاں زیادہ تر پس ماندہ اور چھوٹے طبقے کے لوگ رہتے تھے جن کے پاس ایک بیگھہ سے لے کر دس بیگھہ تک زمین تھی۔ جنہیں وہ جوت کوڑ کر طرح طرح کی فصلیں اُبجایا کرتے۔ اور سالوں بھر کسی نہ کسی طرح زندگی کی گاڑی کے پہیے کو کھینچے رہتے۔ ان کے جسم کا رنگ سخت محنت و مشقت کی وجہ سے کالا پڑ گیا تھا۔ ان کے بازو گٹھیلے تھے۔ ان کی آنکھوں میں خود اعتمادی کی جوت جگی ہوئی تھی۔ اس بستی میں سب مل کر رہتے۔ کسی کو کسی سے خوف نہ تھا۔ وہ اپنی چھوٹی سی دنیا میں مگن تھے۔ باجرے اور مکئی کی روٹی اور اس پر نمک مرچ اور رس گُڑ ان کی زبانوں کو نیا ذائقہ بخشتا۔

اس ذائقہ کی لذت کو وہی لوگ محسوس کر سکتے ہیں جو محنت مزدوری کی روٹی کھاتے ہیں اور اپنے کھیتوں میں خود سے ہل چلا کر اناج پیدا کرتے ہیں۔ اپنی محنت سے پیدا کیا ہوا اناج انہیں جیون کا رس اور سہس بخشتا ہے۔ اس بات کا اندازہ شاید ہی شہر کے وہ لوگ لگا سکتے ہیں جو دوسروں کی محنت پر بھروسا کرتے ہیں اور جو غریبوں کا استحصال کر کے اپنی کوٹھیوں میں چراغاں کرتے ہیں۔ یہاں تو چراغ کی مدھم روشنی میں لوگ غم کو کسی پہلو خوشی بنا کر جی لیتے ہیں۔ زندگی شہر کی ہو یا دیہات کی، ہر حال میں زندگی ہے۔ زندگی کیسے کی جاتی ہے، دراصل یہ دیکھنے کی بات ہے۔ اس لحاظ سے رگھوناتھ پور کے باسیوں کو زندگی کرنے کا گر آتا تھا۔ جس سے شہر کے لوگ محروم ہوتے ہیں۔

وہ جب اپنے میکے شنکر نگر میں تھی تو اسے وہ اطمینان نصیب نہیں تھا، جو اس رگھوناتھ پور میں حاصل تھا۔ اس کی شاید وجہ یہ تھی کہ شنکر نگر شہر کے قریب آباد تھا۔ اور جس بستی پر شہر کی نحوست، دغا، فریب، لوٹ مار، قتل و غارت گری، دہشت گردی اور بے آبروئی کا منحوس سایہ چھایا رہتا تھا۔ وہ جب راموں کے گھر پیدا ہوئی تو اس کے ماتا پتا نے محسوس کیا کہ ان کی چھوری اپنی برادری میں سب سے زیادہ حسین اور مدھ ماتی ہے۔ وہ جیسے جیسے بڑی ہوتی گئی اس کا حسن روز افزوں دوبالا ہوتا گیا۔ لیکن اس کے باوجود چودہ سال چڑھتے چڑھتے اس کی شادی کی سمسیا اس کے ماتا پتا کے لئے ایک دردِ سر بن گئی۔ بہرحال وہ ایک لڑکی تھی اور وہ بھی ایک غریب ماتا پتا کی لڑکی۔ گاؤں میں کوئی ایسا گبرو جوان نہ تھا جو اسے اپنا بنا لیتا اور اس کے ہاتھوں میں اپنے ہاتھوں سے کانچ کی لال لال چوڑیاں پہنا کر اور اس کی مانگ میں سیندور بھر کر اسے بیاہ کر اپنے گھر بٹھا لیتا۔ ادھر کئی مہینوں سے وہ دیکھ رہی تھی کہ گاؤں کے آوارہ لونڈے اس پر بھنورے کی طرح منڈلانے لگے تھے۔ گاؤں کے چوکیدار اور سرپنچ کے چھوکرے اسے بری نگاہ سے دیکھتے۔ وہ

گاؤں میں جس گلیارے اور پگڈنڈی سے گذرتی اس کی راہوں میں ہوس کے جال بچھائے جاتے۔ اس پر آوازے کسے جاتے۔ سب سے زیادہ مکھیا کا لونڈا اودھیش اسے تنگ کرتا۔ وہ اسے دیکھتے ہی سیٹیاں بجانے لگتا۔ وہ اسے دیکھتے ہی سر سے پاؤں تک لرز جاتی اور نزدیک کے مندر میں جا کر بھگوان سے پرارتھنا کرتی کہ اس کا بیاہ شنکر نگر سے دور کہیں ہو جائے۔ تاکہ اودھیش وہاں تک نہ پہنچ سکے۔ سو بھگوان نے اس کی بات سُن لی اور وہ بیاہ کر شنکر نگر سے رگھوناتھ پور چلی آئی۔ جہاں رام بھروسے نے اسے ٹوٹ کر پیار کیا اسے ایک باعزت زندگی دی۔ وہ گاؤں میں سہاگنوں کی طرح رہنے لگی۔ لڑکی جب کسی کی سہاگن بن جاتی ہے تو اسے ایک بڑا سہارا مل جاتا ہے۔ نظریں لڑانا اور کسی غریب لڑکی کی آبرو اور عزت پہ ہاتھ صاف کرنا بڑا آسان ہے۔ لیکن زندگی بھر اسے جیون ساتھی بنانا بڑا ہی کٹھن ہوتا ہے اور وہ رام بھروسے کی جیون ساتھی بن گئی تھی۔ اس کی زندگی پیار اور پاکیزگی سے عبارت تھی۔ وہ جب رام بھروسے کے سینے سے لگ جاتی تو دونوں جہان کی دولت اس کے پاس سمٹ کر آجاتی۔ جہاں نہ تو کسی کا خوف ہوتا اور نہ ڈر۔ وہ تو بس ان سخت باہوں سے لگی زندگی کے کٹھن کوس کو طے کرنا چاہتی تھی۔ اس سے بے نیاز کہ رام بھروسے کے پاس صرف چار بیگھہ کھیت ہیں اور اس چار بیگھہ سے وہ اتنا بڑا پریوار، جو اس کے ساس سسر اور اس کی دو نندوں پر مشتمل تھا، کا کیسے پالن پوسن کر سکے گی۔ اسے رام بھروسے مل گیا تھا۔ اس کے لئے یہی بہت تھا۔

وہ کھیتوں میں رام بھروسے کے ساتھ کام کرتی۔ بھینس اور گائے کے لئے پہاڑی کے پاس اُگے ہوئے خودرو گھاس کاٹ کر لاتی اور چارہ لگاتی۔ وہ جنگلوں سے کاٹ کر لائی ہوئی سوکھی گیلی لکڑیوں سے چولہا روشن کرتی اور رسوئی پکاتی۔

وہ ایک روز شام کو اپنے مویشیوں کے لئے گھاس کاٹ کر گھر لوٹ رہی تھی کہ ایک ناگ نے اس کے پاؤں میں ڈس لیا۔ اس نے اپنی آنکھوں سے اس ناگ کو

سرسراتے ہوئے ایک سمت جاتے ہوئے دیکھا اور جب اسے یقین ہوگیا کہ ایک کالے ناگ نے اسے ڈس لیا ہے تو وہ گویا دوڑتی ہوئی اپنے گھر تک پہنچ گئی۔ اس پر بے ہوشی طاری ہوگئی۔ رام بھروسے اور اس کے سیرما نادین نے جب اس کی یہ حالت دیکھی تو ان لوگوں نے اس سے پوچھا "اری تجھے کیا ہوگیا ہے پرنیما!" وہ بہت ہی مشکل سے اتنا بول سکی "ناگ نے کاٹ لیا ہے۔" اور پھر وہ بول نہ سکی۔ اس کی آنکھیں مند گئیں۔ اور اس پر مکمل غشی چھا گئی۔ رام بھروسے گھبرا گیا۔ اور وہ دوڑا دوڑا نزدیک کے گاؤں شامو اوجھا کے پاس پہنچا۔ شامو اوجھا ناگ کے زہر کو اتارنے کا منتر جانتا تھا۔ اس کا شہرہ نزدیک اور دور تک تھا۔ اس نے کئی مریضوں کو اچھا کیا تھا۔ وہ آیا اور اس نے اپنی خاص زبان میں منتر پڑھنا شروع کر دیا۔ منتر پڑھتے اسے کئی گھنٹے لگ گئے۔ لیکن پرنیما نے آنکھیں نہیں کھولیں۔ پھر بھی شامو اوجھا کو یقین تھا کہ اس کا منتر رائیگاں نہیں جائے گا۔ اور پرنیما ضرور ہوش میں آجائے گی۔ دو دن کے بعد اسے ہوش آیا۔ اس نے آنکھیں کھول دیں۔ ناگ کاٹنے کا یہ پہلا موقع تھا۔ دوسری بار چھ ماہ کے بعد ایک ناگ نے اسے اس وقت ڈسا جب وہ گائے کو سانی لگا رہی تھی۔ اس بار پھر اسے شامو اوجھا نے منتر کی جاپ کر کے اچھا کیا۔ اب کے اسے ایک دن کے بعد ہی ہوش آگیا اور اب ایسا ہوا کہ پرنیما بے چاری کئی بار ناگ کے زہریلے دانتوں کی شکار ہوئی اور ہر بار شامو اوجھا نے ہی اسے جھاڑ پھونک کر اچھا کیا۔ لیکن اب پرنیما کی بے ہوشی میں وہ شدت نہیں تھی جو اس سے پہلے ہوا کرتی تھی۔ اور اب ایسا ہوتا کہ شامو اوجھا کو بلانے کی بھی ضرورت نہیں پڑتی اور وہ ایک دو گھنٹہ کے بعد ہی آنکھیں کھول دیتی۔

ناگ کے بار بار کاٹنے سے گھر والوں کو بڑی فکر اور چنتا تھی۔ ان لوگوں نے پرنیما کو جنگل سے لکڑیاں کاٹنے اور گھاس کاٹنے کے لئے منع کر دیا کہ اب وہ

گھر سے قدم نہ نکالے، بلکہ گھر ہی میں رہ کر کام کاج کرے۔

ایک روز رات کے اندھیرے میں جب وہ اٹھی تو اس نے محسوس کیا کہ گاؤشالے میں دودھ دینے والی گائے اچھل کود کر رہی ہے۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ آخر ماجرا کیا ہے۔ سو وہ چراغ روشن کر کے گاؤشالہ کی طرف گئی۔ اس نے دیکھا کہ ایک بہت بڑا ناگ گائے کے پیروں کو ٹھیک اسی طرح چھانے ہوئے ہے جس طرح رام بھروسے دودھ دوہتے کے وقت گائے کے پچھلے دو پیروں کو رسی سے باندھ دیا کرتا تھا۔ پھر اس نے دیکھا کہ ناگ بڑے ہی اطمینان سے گائے کے تھن سے دودھ پی رہا ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ ناگ ایک طرف چلا گیا اور گائے اطمینان سے جگالی کرنے لگی۔ اور اس روز یہ عقدہ کھلا کہ آخر گائے کا دودھ روز بروز کم کیوں ہوتا چلا جا رہا ہے۔

ایک روز تو اس کے سسر نے اس پر شک بھی کیا تھا کہ ہو نہ ہو پریتما ہی دودھ دوہ کر بیچ دیا کرتی ہے۔ اس الزام کو سن کر وہ گھنٹوں روتی رہی تھی اور جب اس نے رام بھروسے اور اپنے سسر کو یہ بات بتائی کہ اب ناگ دیوتا اس کی گائے کا بھی دودھ پینے لگے ہیں، تو ان کو اس کی باتوں پر بدقت تمام یقین آیا۔ لیکن اس کے سسرال والوں کو اس بات پر خوشی تھی کہ چلو ناگ نے گائے کا دودھ ہی پینے پر اب اکتفا کیا ہے۔ پریتما تو اب ناگ کے ڈسنے سے بچ جائے گی۔ گھر والوں کو اس واقعہ سے اطمینان ہوا۔

پریتما کچھ دنوں کے بعد ماں بھی بن گئی اور اس نے ایک بہت ہی پیارے اور خوب صورت بچے کو جنم دیا۔ چھ ماہ کے بعد وہ اپنے بچے کو گود میں لے کر نزدیک کے درگا مائی کے مندر میں پرساد چڑھانے گئی۔ آم اور مہوے کے ایک باغ سے ہو کر مندر میں جانا پڑتا تھا۔ جیسے ہی وہ ایک آم کے بڑے پیڑ کے سائے سے گذر رہی تھی کہ ایک ناگ نے اس کا راستہ روک لیا۔ اس کا ڈر کے مارے برا حال تھا

یہ سوچ کر کہ کہیں ناگ اس کے بچے کو بھی نہ ڈس لے، وہ سر سے پاؤں تک لرز گئی۔ ناگ اس کے سامنے پھن پھیلائے عجب مستی میں ناچنے لگا اور اپنے آدھے دھڑ سے اس کے سامنے کھڑا ہو گیا اور اس کی طرف عجب خمار آلود، چمکتی ہوئی، ہری، پیلی اور نیلی نگاہوں سے تاکنے لگا۔ وہ ٹھٹھک گئی۔ وہ بھی اسے ایک ٹک دیکھتی رہی اب کے ناگ نے اسے نہیں ڈسا۔ اور اس کا راستہ چھوڑ کر ایک طرف چلا گیا۔ اس واقعہ نے پریتما پر عجیب کیفیت طاری کر دی۔ ناگ کے نہیں ڈسنے پر بھی اس پر وہی خمار اور مدہوشی کی کیفیت چھانے لگی جو وہ ناگ کے ڈسنے پر محسوس کرتی تھی۔ اس نے درگا ماتا کے مندر میں پھول چڑھائے اور اپنے بیٹے کو مندر کی چوکھٹ پر ڈال دیا اور اس کی رکچھا کی پرارتھنا کی۔

پریتما کی زندگی بہت ہی خوش گوار گزر رہی تھی کہ ایک آفت ناگہانی پھر آئی۔ اس نے اپنے مکان کے دالان سے دیکھا کہ شنکر نگر کے مکھیا کا چھوکرا اومیش اپنے دو ساتھیوں کے ساتھ گزر رہا ہے۔ اس کے اوسان خطا ہو گئے۔

پورنیما کی ایک چاندنی رات تھی۔ وہ اپنے مکان سے سیتا دیوی کے یہاں جانے کے لئے نکلی۔ سیتا دیوی کے بیٹے کی شادی تھی۔ جیسے ہی وہ ایک تنگ گلیارے سے سیتا دیوی کے گھر جانے کے لئے مڑی ہی تھی کہ اومیش نے اسے دبوچ لیا۔ پھر اومیش نے اپنے مضبوط ہاتھ سے اس کی کلائی پکڑ لی۔ پھر بولا۔ "تو مجھے چھوڑ کر یہاں آ گئی تھی۔ اب میں تجھے نہیں چھوڑوں گا۔" وہ غصہ سے بھر گئی۔ اور اس نے اومیش کے ہاتھ میں اپنے دانتوں کو گڑا دیا۔ اور وہ آناً فاناً وہیں ڈھیر ہو گیا۔

صبح ہوئی تو پوری بستی میں یہی چرچا تھا کہ مکھیا کے لڑکے کو ناگ نے ڈس لیا ہے۔ اس کا بدن نیلا پڑ گیا تھا۔ لوگوں نے شاتو ادھا کو بلوایا۔ لیکن اس کے پاس اس ناگ کے ڈسنے کا نہ منتر تھا نہ جادو۔ یہ بات صرف پریتما جانتی ہے کہ اومیش کی موت کیسے واقع ہوئی ہے؟ پریتما کو کیا معلوم تھا کہ

جو زہر ناگوں نے اس کے جسم میں داخل کیا ہے وہ ایک روز اس کی عزت و آبرو کا محافظ بن جائے گا۔ اس کے جسم میں ناگ دیوتا نے جو وِش انڈیلا تھا وہ آج امرت بن جائے گا۔

اس دن سے پریتما کی یہ کیفیت ہو گئی ہے کہ اسے ناگوں کو ڈسے کچھ ماہ گزر جاتے ہیں تو وہ گھر والوں کے منع کرنے کے باوجود گھر سے نکل جاتی ہے اور جب تک یہ سانپ اُسے ڈس نہیں لیتے یا اس کی گردن کا ہار بن کر اس کے منہ پر پھنکارتے نہیں یا پھر اس کے قدموں سے لپٹ کر اپنی محبت کا اظہار نہیں کرتے اس وقت تک وہ بے چین رہتی ہے۔ اس نے وِش ہی کو امرت بنا لیا ہے۔ جسے ناگوں نے پروان کیا ہے۔ پریتما واقعی ایک مہان عورت ہے۔

●●

دیوار گر چکی ہے

گھنشیام بابو کے ریٹائر ہونے میں صرف ایک مہینہ پانچ دن باقی رہ گئے ہیں۔ ہر کوئی، ان سے پوچھتا ہے۔ "آپ کب ریٹائر ہو رہے ہیں؟" یہ سوال اُن کے کلیجے میں تیر سا چبھتا ہے۔ وہ اس جملے کو اپنے لئے ایک طنز سمجھتے ہیں۔ بھلا یہ بھی کوئی سوال ہے۔ مرنے والے سے یہ پوچھا جائے کہ "تم کب مر رہے ہو؟" تو اسے کیسا لگے گا۔ کوئی مرنا تھوڑا ہی چاہتا ہے۔ قبر میں پاؤں لٹکائے ہوئے انسان بھی یہی چاہتا ہے کہ وہ کچھ روز اور جئے ______ ریٹائر ہونے والا کرمچاری بھی یہی چاہتا ہے کہ اس کی ریٹائرمنٹ کی مدت اور بڑھے ریٹائرمنٹ کے تصور ہی سے انسان پر مُردنی چھا جاتی ہے۔ اور پھر وہ سروس سے ریٹائر کریں یا زندگی سے، ہمدردی جتلانے اور دِکھاوا کرنے کا جہاں تک تعلق ہے، تو انہیں اچھی طرح معلوم ہے کہ ریٹائرمنٹ کے بعد آفس سے وداع ہوتے وقت، آفس والوں نے اگر بہت کچھ کیا تو بس ایک وداعی میٹنگ کر لی۔ جیسے مرنے کے بعد لوگ تعزیتی میٹنگ کر لیتے ہیں اور مگرمچھ کے آنسو بہاتے ہیں۔ خواہ زندگی بھر مرنے والے کی وہ بُرائی ہی کیوں نہ کرتے رہے ہوں۔ اسے آپ مگرمچھ کے آنسو ہی تو کہیں گے کہ جب ہری کشور لال ریٹائر ہوا تو وداعی میٹنگ میں بڑے صاحب نے اس کی محنت، لگن، صلاحیت اور اُس کی ایمانداری کے ایسے گُن گائے کہ لوگوں کی آنکھیں بھر آئیں۔ حالانکہ ہمیشہ بڑے صاحب نے اُسے ڈانٹا، پھٹکارا ہی۔ اس کے خلاف ریمارک پر ریمارک دیئے اور "وجہ بتاؤ نوٹس" کی تو بھرمار کر دی۔ حتیٰ کہ اس کا پروموشن بھی رُک گیا۔ ریٹائرمنٹ کے بعد جب پنشن، گریجویٹی،

اور گروپ انشورنس کے روپے نکالنے کی بات آئی تو آفس کے بڑے بابو نے ایسی نظر بدلی کہ جیسے اس سے ان کی کبھی دید و شنید تھی ہی نہیں۔ آفس میں کوئی پہچانتا ہی نہیں دیوار و در تو سب اجنبی سے دکھائی دینے لگے۔

گھنشیام بابو اس حقیقت سے اچھی طرح واقف ہیں کہ ریٹائر ہونے کے بعد ان کے اعزاز میں وداعی سماروہ منعقد کر دیا جائے گا۔ ایک چھڑی اور ایک ٹوپی ان کو نذر کی جائے گی کہ یہی ریٹائرمنٹ کی نشانی ہے۔ اور پھر ان کی طرف ہمدردی کے چند گھسے پٹے جملے اچھال دیئے جائیں گے۔ بس اللہ اللہ خیر صلّا۔

اِن کی ریٹائرمنٹ کی تاریخ قریب آرہی ہے۔ انہوں نے اپنے آپ کو تندرست و توانا رکھنے اور عمرِ ناپائدار کے بچے کھچے لمحات کو خوش گوار طور پر گزارنے کے لئے تیار کر لیا ہے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد ان کی نئی زندگی کی شروعات ہونے والی ہے وہ ریٹائرمنٹ کے بعد بھی جینا چاہتے ہیں۔ کیوں کہ ان پر ابھی بہت ساری ذمہ داریاں ہیں۔ جنھیں ان کو نبھانا ہے۔ اس کے لئے انہوں نے بہت سارے پروگرام بنائے ہیں، خواب دیکھے ہیں۔ خواب دیکھنے کے لئے تو چند دن ہی کافی ہیں۔ انہوں نے ایک مہینہ بلکہ دن کے اندر اپنی جاگتی ہوئی آنکھوں سے بہت سارے خواب دیکھے ہیں۔ اٹھتے بیٹھتے آفس آتے جاتے، آفس میں فائل پر نوٹنگ کرتے، حتیٰ کہ آفس کے بڑے صاحب کے پاس جاتے ہوئے بھی۔

بڑے صاحب ان سے پوچھتے۔ "گھنشیام بابو! اُس فائل کا کیا ہوا۔؟"

اور وہ خواب کے تانے بانے بنتے رہتے۔

بڑے صاحب جھنجھلاتے ہوئے کہتے۔ "میں آپ ہی سے پوچھ رہا ہوں۔"

اور تب وہ چونکتے" اور جواب دیتے۔

اب ان خوابوں کے دریچے بند ہو گئے۔ اور قیدِ ملازمت سے انہیں رہائی مل گئی۔ اور وہ اب اپنے گھر چلے آئے۔

ان کا مکان ایک بڑے شہر کے گنجان آبادی والے علاقے میں واقع تھا جو انہیں اپنے پتا سے ملا تھا۔ ان کے پتا شہر میں ایک اچھے سرکاری عہدہ پر فائز تھے۔ اپنے وقت میں انہوں نے کافی کمایا اور کافی لٹایا بھی۔ گھنشیام بابو اپنے والدین کے اکلوتے لڑکے تھے۔ پتا نے جو کچھ کمایا، انہیں ہاتھ تو نہیں لگا لیکن یہ موروثی مکان بچ گیا تھا جسے ان کی ماں نے اپنے نام سے لکھوا لیا تھا تاکہ وہ اسے نہ بیچ سکیں۔ یہ مکان خاصا بڑا تھا، لیکن کافی پرانا تھا۔ اس کی خستہ حالی در و دیوار سے ٹپکتی تھی۔ جگہ جگہ دیواروں، چھتوں اور فرش میں دراڑیں پڑ گئی تھیں۔

گھنشیام بابو جب ریٹائر ہو کر اپنے پرانے مکان میں آئے تو انہیں بہت ساری سمسیاؤں نے گھیر لیا۔ وہ جب سروس میں گھر سے دور تھے تو انہیں گھر کی چنتا نہیں تھی۔ وہ ہر ماہ اپنی تنخواہ کی ایک مقررہ رقم گھر پر بھیج دیتے اور بے فکری سے اپنی ڈیوٹی بجا لاتے۔ لیکن یہاں آنے کے بعد انہیں پتہ چلا کہ گھر کا نقشہ ہی بدلا ہوا ہے۔

ان کے دونوں لڑکے برسر روزگار تھے۔ شادی شدہ تھے، بال بچے والے تھے لیکن دونوں بھائی ایک دوسرے سے کھنچے کھنچے سے رہتے۔ انہوں نے محسوس کر لیا کہ ان کے دونوں بیٹوں کے درمیان نفرت اور دشمنی کی ایک دیوار کھڑی ہو گئی ہے۔ اس بات کا تو علم پہلے ہی ہو چکا تھا کہ بڑکو اور چھوٹکو میں بن نہیں رہی ہے اور بہت ہی زیادہ تناؤ ہے۔ دونوں نے ہی اپنی ماں سے کہہ دیا ہے کہ وہ اب ساتھ نہیں رہ سکتے۔ لیکن ان کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہیں تھی کہ اتنی جلدی ان کے دلوں کے اندر شگاف پڑ جائے گا۔

انہوں نے گھر میں آ کر دیکھا کہ ایک چولہے کے عوض تین چولہے گھر میں روشن ہیں۔ اوپر کی منزل میں بڑی بہو نے اپنا چولہا جلا رکھا ہے۔ نیچے کی منزل میں ایک طرف چھوٹی بہو نے چولہا چکی سنبھال رکھی ہے اور ایک کونے میں گھنشیام بابو کی

بنتی اپنی کنواری بیٹی کے ساتھ چولہا پھونک رہی ہے۔ ماں بیٹی کو الگ کھانا پکاتے دیکھ کر گھنشیام بابو پر گویا بجلی سی گر پڑی۔

آخر ایسا کیوں ہوا ؟

گھنشیام بابو کی بیٹی شکنتلا نے بتایا کہ رسوئی میں دونوں بھابھیوں میں زبردست تو تو میں میں ہوتی تھی۔ بڑی بھابھی چھوٹی بھابھی پر الزام دھرتیں کہ وہ نہ تو برتن مانجھتی ہیں اور نہ چولہا سلگاتی ہیں اور گھر کا کوئی کام کاج نہیں کرتیں۔ اور چھوٹی بھابھی بھی اس کے لئے بڑی بھابھی کے سر سارا الزام تھوپنے کی کوشش کرتیں۔ جو جھوٹے برتن پانی کے نل کے پاس دن بھر پڑے رہتے اور ان پر مکھیاں بھنبھناتی رہتیں۔ گھر میں کوڑا کرکٹ کا انبار لگا رہتا۔ ساس اگر کچھ بولتیں تو دونوں بھابھیاں بےچاری ساس پر برس پڑتیں اور کہتیں۔

" ایک ہم ہی ہیں کیا ؟ "

اس جملہ کا بس ایک ہی مطلب تھا کہ شکنتلا ان کے کاموں کو نپٹائے۔ اور یہی ہوتا۔ تنہا بےچاری شکنتلا کو بہت سارا کام کرنا پڑتا۔ چولہا سلگانے سے دال بگھارنے تک وہ رسوئی گھر میں مصروف رہتی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ایک روز شکنتلا کی دونوں بھابھیوں نے اپنے اپنے برتن الگ کر لئے۔ خیر یہ اچھا ہوا کہ ایک مصیبت سے تو نجات ملی۔ روز روز کا جھنجھٹ تو ختم ہوا۔ لیکن اسی پر بس نہیں تھی۔ معمولی باتوں کو لے کر تینوں میں کہا سنی شروع ہو جاتی۔

گھنشیام بابو گھر کے اس ماحول کو دیکھ کر کڑھتے رہتے۔ انہوں نے سوچا تھا کہ شکنتلا کی شادی کی سمیا ہی ایک رہ گئی ہے۔ سو اسے اب کے لگن میں نپٹا دیں گے۔ اس وقت تک آفس سے ان کے تمام روپے بھی مل جائیں گے۔ پوری پنشن بھی جاری ہو جائے گی۔ تھوڑی بہت رقم کی جو ضرورت پڑے گی وہ بڑکو اور چھوٹکو سے مانگ لیں گے کہ وہ اپنی بہن کی شادی میں مدد کریں۔ لیکن یہاں تو روزانہ گھر میں مار پیٹ

اور خون خرابہ کا داتا ورن تھا۔ ان کی زندگی ریٹائرمنٹ کے بعد پریشانیوں میں اور گھر گئی۔ وہ کریں تو کیا کریں۔ ان کے دونوں لڑکے اب انھیں آرام سے مرنے بھی نہیں دیں گے۔

شکنتلا کا رشتہ طے ہو چکا تھا۔ اچھا بر ملا تھا۔ کھاتے پیتے لوگ تھے۔ جہیز دینے کا گمبھیر مسئلہ تھا۔ گریجویٹی، جی پی ایف، گروپ انشورنس وغیرہ کے روپیوں کا ہی صرف آسرا تھا۔ اگر یہ تمام روپے یکمشت مل جاتے تو زیادہ پریشانی اٹھانی نہیں پڑتی۔ لیکن آفس سے روپے ملنے میں ابھی دیر تھی اور لگن کا وقت پاس آرہا تھا۔ انتظام تو کہیں نہ کہیں سے بہر حال کرنا ہی تھا۔ انہوں نے اپنے ہونے والے سمدھی کو زبان دے دی تھی۔ ایک روز انہوں نے ڈرتے ڈرتے اپنے بڑے بیٹے کو بلاکر کہا:

شکنتلا کی شادی طے ہو چکی ہے۔ تم اس موقع پر اپنی بہن کے لیے کتنے روپے دے سکتے ہو؟۔ اس نے ٹکا سا جواب دیا۔" بابو جی! مجھ سے کچھ نہیں ہو سکتا۔ ایک ہم ہی ہیں کیا۔؟"

گھنشیام بابو بولے۔ یہ بڑا ہی خطرناک جملہ ہے بڑکو! اس جملے نے نہ جانے کتنے خاندانوں کو تباہ و برباد کر دیا ہے۔ یہ جملہ دراصل تمہاری غیر ذمہ داریوں کی نشان دہی کرتا ہے۔ ہر کوئی اگر یہی کہے اور اپنی ذمہ داریوں کو دوسرے کے سر تھوپ کر چپ ہو جائے تو یہ گھر سنسار کیسے چل سکتا ہے۔"

انہوں نے ذرا سوچ کر کہا۔" میں اب چھوٹکو سے اس سلسلے میں نہیں کہوں گا۔ کیونکہ میں جانتا ہوں کہ وہ یہی کہے گا۔" ایک ہم ہی ہیں کیا۔"

پھر وہ ذرا جذباتی ہو گئے۔ بولے۔" ذرا سوچو! جب ہم نے تم دونوں کو پالا پوسا، تعلیم دلوائی، نوکری چاکری پر لگوایا۔ میں بھی اگر اس وقت یہی کہتا کہ " ایک ہم ہی ہیں کیا، تو تم دونوں آج کہاں رہتے۔ ایسا سوال کر کے کیا ایک باپ اپنا فرض نبھا سکتا ہے؟۔ تم بیٹے ہو۔ شاید تم لوگوں نے فرار کی یہی صورت

نکالی ہے اور اسی جملے میں تم لوگوں نے پناہ ڈھونڈی ہے۔ ذرا خیال کرو۔ تمہارے بچے بھی تم سے سوال کریں گے تو اس کا کیا جواب دو گے۔"

گھنشیام بابو کی تیز آواز سُن کر کہیں سے چھوٹا لڑکا بھی آگیا وہ معاملہ کی نزاکت کو سمجھ کر خاموش رہا۔ بولتا بھی تو کیا بولتا۔

برسات شروع ہو گئی تھی۔ رات ہوئی تو زور زور سے بارش ہونے لگی شکستہ دیواروں اور چھتوں سے پانی بے تحاشا مکان میں گرنے لگا۔ سبھی کے دل دہلنے لگے کہ مکان کی کوئی دیوار اب گری اور تب گری۔

صبح ہوئی تو دونوں بیٹوں نے مل کر گھنشیام بابو کے سامنے ایک نیا ہنگامہ کھڑا کر دیا۔ دونوں نے مل کر یہ مطالبہ رکھا کہ وہ اپنی زندگی ہی میں مکان کا بٹوارہ کر دیں اور دونوں بیٹوں کو دے دیں۔ ایسا اگر انہوں نے نہیں کیا تو خدشہ ہے کہ آپ کے بعد مکان کو لے کر ان کے درمیان زبردست جھگڑا شروع ہو جائے گا۔

گھنشیام بابو یہ سُن کر بھونچکا سا رہ گئے۔ اپنے اوپر بمشکل قابو پا کر بولے:

"تم نے اپنے دلوں کو بانٹ دیا ہے اور اب مکان کو بانٹنا چاہتے ہو۔ ہم جیتے جی مکان کا بٹوارہ نہیں ہونے دیں گے۔" پھر گھنشیام بابو غصے میں گویا تڑپ کر بولے۔

"مکان کو بانٹ کر تم دونوں سکون سے نہیں رہ سکتے۔ ارے بچو! پہلے تم اپنے دلوں کی ان شکستہ دیواروں کو درست کرو جن میں نفرت، بغض و عناد کے سانپ، بچھو پل رہے ہیں۔ اگر تمہارے دل اِن سے پاک نہیں ہوئے، تو پھر جیون ہی بیکار ہے۔

اتنے میں مکان کی دیوار گرنے کی آواز آئی۔ دونوں لڑکے چیختے ہوئے ان کے پاس آئے اور بولے: "بابو جی! دیوار گر رہی ہے۔"

"گھنشیام بابو بڑے ہی اداس لہجے میں بولے۔ دیوار گر نہیں رہی ہے بلکہ دیوار تو کب کی گر چکی، اب چھت بھی بیٹھنے والی ہے۔ بچو اپنے سر کو بچاؤ۔"

●●

دودھ کا قرض

"شیاما! تو ہمیں چھوڑ کر شہر جا رہا ہے؟" رحمو کے باپ کلیم اللہ نے کانپتے ہوئے رعشہ زدہ ہاتھوں کو اٹھا کر، لرزتی ہوئی آواز میں پوچھا۔ جس کے پٹ سن کی طرح سفید بال، دھنسی ہوئی بے نور آنکھیں، دانتوں سے محروم پوپلا منہ اس بات کی گواہی دے رہا تھا کہ وہ ضعیفی کی سرحدوں کو بھی پار کر چکا ہے اور اب اس کی زندگی کا چراغ گل ہی ہوا چاہتا ہے۔

پھر کلیم نے اسے اپنے پاس بلاتے ہوئے اور اپنے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے اسے گویا ٹٹولتے ہوئے کہا:

"شیاما! میرے پاس آ بیٹے! میرے ایک دم قریب۔" پھر اس نے اپنی سانسوں پر قابو پاتے ہوئے کہا:

"میں تمہیں دیکھ نہیں سکتا۔ مگر میرا ذہن کام کر رہا ہے۔ تمہارا ایک ایک بال، گول مٹول چہرہ، تیرے چہرے کے خد و خال سب میرے ذہن پر نقش ہیں۔ میری آنکھیں مجھے دھوکا دے سکتی ہیں مگر میرا بوڑھا ذہن مجھے دھوکا نہیں دے سکتا۔"

انسان آنکھیں نہیں رہنے پر بھی بہت کچھ دیکھ سکتا ہے۔ اس کی تیسری آنکھ وہاں کام کرتی ہے۔ ان آنکھوں میں وہ احساس کی ایک دنیا بسائے رہتا ہے۔ وہ انسان کبھی کشمیر نہیں جاتا لیکن وہ ان آنکھوں سے کشمیر کی وادیوں، مرغزاروں، زعفران کے کھیتوں اور سیب کے لہلہاتے ہوئے باغوں کو دیکھتا ہے۔ وہ خیالوں ہی خیالوں میں وہاں کے ڈل اور جھیلوں کی سیر کرتا ہے اور کشمیر کے مناظر قدرت کو اپنی

آنکھوں کی پلکوں میں سمیٹ لیتا ہے۔ وہ پنجاب نہیں جاتا ہے، لیکن وہ پنجاب کے دریاؤں اور سوندھی سوندھی مٹی کی کنواری خوشبو اپنی روح میں اُتار لیتا ہے۔ انسان اوپر سے کچھ دکھائی دیتا ہے لیکن اندر سے صحیح معنوں میں وہ کچھ اور ہوتا ہے۔ دراصل اندر کے انسان کو زندہ رہنا چاہئے۔ اس کی روحِ انسانیت زندہ رہنی چاہئے۔ اور یہی ایک اچھے اور بھلے انسان کی پہچان ہے۔ اسی پہچان کو اپنے سینے سے لگائے کلیم اللہ زندہ تھا۔ وہ اس وراثت کو آنے والی نسلوں کو سونپ کر مرنا چاہتا تھا۔

ایسے لوگ تو بدنصیب ہیں، کور چشم ہیں جو آنکھ رکھتے ہوئے بھی کچھ نہیں دیکھ پاتے۔ ان کا دل مردہ، ضمیر بے جان اور ذہن بے حس ہوتا ہے۔ احساس کی کوئی دھنک ان کی بصارت کو جلا نہیں بخشتی ہے۔

اور پھر رحمو، رحمو کا باپ کلیم اللہ، اس کی ماں اور اس کی بہن کلثوم اور اس کا پورا پریوار شیاما، شیاما کی ہونے والی ماں اوما دیوی، شیاما کے بوڑھے باپ سرجو، شیاما کی بہن دیپا کو کیسے بھول سکتا تھا۔ کہ ان دونوں خاندان کا مرنا جینا ایک ساتھ تھا۔ وہ دونوں خاندان ایک دوسرے کے جنم جنم کے ساتھی، ایک دوسرے کا دکھ بٹورنے والے اور ایک دوسرے کی مصیبت میں کام آنے والے تھے۔

گاؤں والے اس بات کو اچھی طرح جانتے تھے کہ شیاما کو جب اس کی ماں اوما دیوی نے جنم دیا تھا، تو وہ اسے روتا ہوا چھوڑ کر اسی وقت پرلوک سدھاری تھی۔ چند گھنٹوں کا یہ چھوٹا سا بچہ اپنی ماں کی ممتا سے محروم ہو گیا تھا۔ گاؤں کے ہندو مسلمان، سبھوں کو اس بات کا غم تھا کہ اوما دیوی نوزائیدہ بچی کو جنم دے کر مر گئی۔ اب یہ بچہ کس کے سہارے زندہ رہ پائے گا۔ اسے دودھ کون پلائے گی۔ دیپا تو اس سے صرف تین سال بڑی ہے۔

جب اوما دیوی کی ارتھی اُٹھی تو دیپا اور اس نوزائیدہ بچے کو دیکھ کر وہاں پر جمع سبھی عورتوں کی آنکھیں آنسوؤں سے بھیگ گئیں۔ لیکن وہاں پر کوئی ایسی عورت نہ تھی جو اس روتے ہوئے بچہ کو اپنی چھاتی سے لگالیتی۔ معاً کلیم اللہ کی بیوی صغریٰ آگے بڑھی اور اس روتے ہوئے بچہ کو اپنی گود میں اُٹھالیا اور اس کے منہ سے اپنی چھاتی لگادی۔ بچہ صغریٰ کی چھاتی سے لگا دودھ پینے لگا۔ اور اس طرح شیاما کو صغریٰ کے روپ میں اپنی ماں ملی۔ وہ کلیم اللہ کے گھر پرورش پانے لگا۔

شیاما کا باپ سرجو اور کلیم اللہ ایک ہوٹ کے دو ڈال پہلے سے ہی بنے ہوئے تھے۔ اب اس معصوم بچہ نے ان دونوں گھرانوں کو ایک ایسے مضبوط رشتہ سے جوڑ دیا جسے نہ تو کوئی مذہب توڑ سکتا تھا، اور نہ ہی کوئی ذات برادری ——— شیاما اور کلیم اللہ کا بیٹا رحمو، دونوں ساتھ ہی جوان ہوئے، پلے بڑھے۔ دونوں نے ہی ایک عورت کا دودھ پیا۔ دونوں نے پاٹھ شالہ سے لے کر مولوی ابراہیم کے مدرسہ میں تعلیم پائی۔ اور اب شیاما اور رحمو دونوں گاؤں کے ہائی اسکول سے میٹرک کا امتحان پاس کر چکے تھے۔ شیاما کی نوکری شہر کے ایک پرائمری اسکول میں، اور رحمو کی نوکری گاؤں کے ہی بلاک میں ہو چکی تھی ——— سو شیاما شہر جا رہا تھا۔ پہلی بار وہ سرجو اور کلیم اللہ سے جدا ہو رہا تھا۔ جدائی کا غم سرجو کو بھی تھا اور کلیم اللہ کو بھی۔

کلیم اللہ نے شیاما سے کہا "تم تو سمجھدار ہو، اور جانتے ہو کہ جس طرح رحمو میرا بیٹا ہے، اسی طرح تم میرے بیٹے ہو۔ میں نے جس طرح اپنی بیٹی کلثوم کو نزدیک کے گاؤں رام نگر کے مکھیا خلیفہ سلامت میاں کے

بیٹے سے بیاہا، اسی طرح دیپا کا بھی بیاہ ہم نے رچایا تھا۔"

شیاما کلیم باوا کے ایکدم نزدیک آگیا، حتیٰ کہ کلیم کی سانسوں کا لمس وہ اپنے چہرے پر محسوس کرنے لگا۔ کلیم نے اسے اپنے کمزور ہاتھوں سے اپنی پوری طاقت سے اپنی گود میں بھینچ لیا۔

شیاما کے چہرے پر جب کلیم نے ہاتھ پھیرا تو اسے محسوس ہوا کہ اس کا رخسار آنسوؤں سے تر ہو گیا ہے۔

" مت روؤ بیٹے! مت روؤ۔ تم جہاں رہو خوش رہو۔ میری یہی دعا ہے۔"

شیاما اپنے جن جذبات کو مسوسے اتنی دیر تک بیٹھا تھا، اور ضبط کئے خاموش تھا، اس کا بند ٹوٹ گیا۔ وہ اپنے آپ پر قابو نہ پا سکا۔ بولا:

" باوا! میں اس لئے رو رہا ہوں کہ مجھے اپنے جیون کے بچپن کی تمام باتیں یاد آگئیں۔ جب میں نے اس دنیا میں آنکھیں کھولی تھیں، تو اس وقت مجھے معلوم نہیں تھا کہ میری اپنی ماں مر گئی ہے۔ میں نے تو رحمو بھیا کی ماتا کو ہی اپنی ماتا سمجھا۔ میں تو ان کا ہی دودھ پی کر پلا، بڑھا اور جوان ہوا۔ میری اپنی ماں مر گئی تو کیا ہوا۔ بھگوان نے تو میری ماں کے مرنے کا احساس کبھی نہ ہونے دیا۔" پھر وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا اور کلیم باوا کی گردن سے لپٹ کر رونے لگا۔ " سوچتا ہوں کہ اس جنم میں دودھ کا یہ قرض چکا سکوں گا یا نہیں۔"

اور شیاما اپنی نوکری پر شہر چلا گیا۔ اسے گئے ہوئے چھ ماہ ہو گئے۔ اسے دیکھنے کے لئے ترجو اور کلیم بیا کل تھے۔ وہ اتنے دنوں تک کبھی ان کی آنکھوں سے دور نہیں ہوا تھا۔ رحمو کا بھی دل شیاما کے

بغیر سونا سونا سا لگتا ـــــ

سرجو اور کلیم اللہ، دونوں اپنے بیٹوں رحمو اور شیاما کی شادی اب کے لگن ہیں کرنا چاہتے تھے۔ کچھ روز کے بعد عید کا چاند بھی دکھائی دینے والا تھا۔ اس لئے دونوں نے سوچا کہ اس سے بہتر اور کوئی موقع نہیں آنے والا ہے۔ سرجو اور کلیم، دونوں نے مل کر شیاما کو ایک خط لکھ بھیجا کہ وہ ہولی میں ضرور آئے، اور ایک ماہ کی چھٹی لے کر آئے۔ تمہارے رحمو بھیا کی بھی شادی کرنی ہے۔ یاد رہے۔" اور پھر اسی خط میں دونوں نے یہ بھی لکھ دیا کہ "ذرا سنبھل کر اور ہوشیاری سے آنا کہ گاؤں کا واتاورن کچھ بگڑا ہوا نظر آتا ہے۔"

شیاما نے جب اپنی اور رحمو بھیا کی ہونے والی شادی کی خبر پڑھی تو اس کے دل میں بسنت کی بہاریں اور ادھ کھلی کلیوں کے چٹکنے کی ایک دھیمی سی لے کا احساس تو ہوا لیکن اس احساس پر اس لمحہ اداسی سی پڑ گئی جب اس نے گاؤں کے واتاورن کے بگڑنے کی بات پڑھی۔

وہ سوچنے لگا۔ ہمارے گاؤں کا واتاورن، کیسا واتاورن؟ ہمارا واتاورن، ہماری روایت تو ایک زمانے سے یہ رہی ہے کہ ہمارے گاؤں میں تمام ذات کے لوگ، غریب، بے بس انسان، اونچے نیچے لوگ، ہندو مسلمان، سب ساتھ رہتے آئے ہیں۔ سبھوں نے مل کر محبت کا ایسا راگ الاپا ہے کہ ما لوتا اس پر رشک کرتی ہے۔ ہماری بھائی چارگی اور میل ملاپ اور پیار کی قسمیں دُور دُور کے گاؤں والے اور شہر والے بھی کھاتے ہیں۔ ہم سب مل کر

کھیت جوتتے ہیں، اناج پیدا کرتے ہیں۔ ہماری گائیں، بھینسیں اور بیل ہماری تیار کھڑی فصلیں کھا بھی جاتے ہیں تو کبھی کسی کسان، یا کسی ہلواہے نے شور تک نہیں مچایا۔ ہولی اور بسنت میں ہمارے کپڑے عبیر اور گلال سے بھیگ جاتے ہیں اور گاؤں کی گوریاں پچکاریوں سے لال اور گلابی رنگ ایک دوسرے پر ڈال کر، پیار کے ماحول میں شرابور ہو جاتی ہیں۔ عید اور محرم، دیوالی اور دسہرہ ہم سب مل کر مناتے ہیں۔ کبھی کوئی روٹھا تک نہیں۔ بھرتتا اور تقدس کی ایسی فضا کہ دامن نچوڑ دیں تو فرشتے وضو کریں۔

ہمارے چوپال اور پنچایت بھون میں کیا اب نوجوانوں اور بوڑھوں کی ٹولیاں بیٹھ کر ایک دوسرے کا دکھڑا نہیں سُنتی ہیں۔ اب آلہا اور لوک گیت نہیں گائے جاتے۔ کیا اب وہاں ہنسی، مذاق، خوشی اور مسرت کے چراغ نہیں جلائے جاتے۔؟

یہی سوچ سوچ کر وہ سوہان روح ہوا جارہا تھا۔ کیا سدبھاؤنا کا واتاورن بگڑ گیا ہے۔؟ نہیں نہیں ایسا نہیں ہو سکتا۔ ہمارا خوش گوار واتاورن، ہمارا دھرم نرپیکھتا، ہمارا "سرو دھرم سمبھاؤ" ہم سے کوئی چھین نہیں سکتا۔ ہم اس کے وارث ہیں، ہم اس کے امین ہیں، رکھوالے ہیں۔

ابھی تو ہولی کے تہوار کو آنے میں دیر تھی۔ اس نے پہلے ہی سوچ رکھا تھا کہ وہ ہولی کی چھٹی میں گاؤں ضرور جائے گا۔ اب کے ہولی میں دیپا بہن رہے گی۔ اور کلثوم دیدی تو رمضان کے روزے یہیں گاؤں میں سسرال سے آ کر رکھ رہی ہے۔ بڑا مزہ آئے گا۔ اپنی

کمائی ہے وہ دونوں بہنوں کے لئے ڈھیر سا کپڑا خریدے گا۔ مٹھائیاں لے جائے گا اور بپتا اور باوا دونوں کے لئے اچھے قسم کے جوتے ضرور خریدے گا۔ گاؤں کے بنے ہوئے پُر انے ساخت کے چمڑے کے جوتے، پہنتے پہنتے، دونوں کے پیر کے تلوے اور انگلیوں کی چمڑی کا رنگ بدل گیا ہے۔ تیسی کا تیل بھلا چراغ میں جلانے کے لئے ہوتا ہے یا جوتے میں ڈالنے کے لئے۔ یہاں کے لوگ بھی عجیب خیال کے ہیں۔ کہتے ہیں کہ تیسی کے تیل سے بھگوئے ہوئے جوتے نرم تو ہوتے ہی ہیں، ان سے آنکھ کی روشنی بھی بڑھتی ہے۔ تو کہاں روشنی بڑھی۔ میرے کلیم باوا کی آنکھوں سے تو روشنی چلی گئی۔ تیسی کا تیل کہاں کام آیا۔؟ وہ ان کے چرخانی جوتوں کو ضرور پھینک دے گا۔ اور ان دونوں کو نئے جوتے پہنائے گا۔ اتنی طویل چھٹی اگر اس کے آفیسر نے نہیں دی تو وہ بغیر تنخواہ کے ہی چھٹی پر چلا جائے گا۔ مگر وہ جائے گا ضرور۔ اسے فوراً جانا چاہئے۔

خط ملتے ہی اس نے ہولی کی سرکاری تعطیل کا خیال کئے بغیر اپنے آفیسر کو ایک ماہ کی چھٹی کی درخواست دے دی۔ اور وہ گاؤں روانہ ہوگیا۔ راستہ بھر "وانادرن" کے ایک لفظ نے اسے چین لینے نہ دیا۔ وسوسوں اور خدشات کے چنگل میں جکڑا وہ گاؤں پہنچا۔

اسٹیشن سے اس کا گاؤں بہت ہی نزدیک تھا۔ اس لئے اسے گاؤں پہنچنے میں دیر نہیں لگی۔ وہ گاؤں جب پہنچا تو اس وقت شام ہوچکی تھی۔ اکا دُکا کہیں کہیں چراغ روشن تھے۔ اس نے محسوس کیا کہ ان چراغوں میں پہلی سی روشنی نہیں ہے۔ پیلی اور بیمار سی مدھم

روشنی۔ اس نے دیکھا کہ کالو ماما اور رام کھلاون کی دکانیں سرِشام ہی بند ہو چکی ہیں، جب کہ اس سے قبل یہ دکانیں اس وقت بند ہوتی تھیں جب عشاء کی نماز کے لئے مؤذن کی اذان کی آواز سنائی دیتی تھی۔ آج کیوں ان کی دکانیں اتنا سویرے بند ہو گئی ہیں۔؟

راستے میں جب وہ پنچایت بھون سے گزرا تو اس نے دیکھا کہ یہاں ایک لالٹین جل رہی ہے اور کچھ لوگ بیٹھے ہیں۔ اس نے ان کو پہچان لیا۔ رام کھلاون کا بیٹا دسرتھ، آٹا چکی والا ستر دگھن، دکھی ہلواہا، مرلی دھر، منگوا، جھنگوا، اور دو تین نوجوان بیٹھے تھے۔ اسے تعجب ہوا کہ پنچایت بھون میں آج ستو دادا، رحمو، شیخ جمن، املی تلے والے مزار کے مجاور خیرو میاں وغیرہ نہیں ہیں۔" واتاورن " کی تبدیلی کے اس پہلے پڑاؤ پر وہ ذرا تھوڑی دیر کے لئے رکا، اور پھر اپنے گھر کی طرف بڑھ گیا۔ اس کے اپنے گھر کی دہلیز پر ہی اس کی دونوں بہنیں دیپا اور کلثوم کھڑی ملیں۔

" تم دونوں یہاں کھڑی کیا کر رہی ہو، پتا جی کہاں ہیں اور باوا کہاں ہیں۔ اور رحمو بھیا کہاں ہیں۔ اور ماں کہاں ہیں۔" یہ تمام سوالات اس نے ایک ہی سانس میں کر ڈالے۔

" بھیا! تم جلدی سے اندر آ جاؤ۔ باہر بڑا اندھیرا ہے۔ لوگ ڈر کے مارے گھر سے نہیں نکل رہے ہیں۔"

" کیسا ڈر، کس سے ڈر، یہاں تو سب اپنے ہیں۔"

" یہاں کچھ دنوں سے ہمارے گاؤں کی فضا کو بگاڑنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ تم اندر آؤ نا۔ اور دروازہ بند کر لو۔ ہم لوگوں نے اپنے دونوں گھروں کی کھڑکیاں اور تمام دوسرے دروازے

بند کر دیے ہیں۔"

"پگلی کہیں کی۔ ڈرنے سے کیا ہوگا۔ اسی ڈر اور دہشت نے تو ہمارا واتاورن بگاڑ دیا ہے۔ ہم حالات کا مقابلہ کریں گے۔ گاؤں کے سیدھے سادے لوگوں کو معلوم ہوتا ہے کچھ لوگوں نے غلط قسم کی بات بتا کر ہم سبھوں کو ایک دوسرے سے الگ کرنے کی گھناؤنی سازش کی ہے۔ ہم یہ سب کچھ نہیں ہونے دیں گے۔" شیاما نے بہت ہی پر تیقن لہجے میں کہا۔

اتنے میں بغل والے مکان سے رحمو، اس کے پتا سرجو اور لاٹھی کا سہارا لیتے ہوئے اور ٹٹولتے ہوئے اس کے کلیم بابا، اور صغریٰ، سب ہی آ گئے۔

پہلے تو شیاما ان سبھوں سے باری باری گلے ملا اور پوچھا۔ "یہ سب گاؤں میں کیا ہو رہا ہے۔؟"

"بہت واتاورن خراب ہو چکا ہے۔ حالات بگڑتے چلے جا رہے ہیں۔ مذہبی منافرت کا زہر پھیلایا جا رہا ہے۔"

"صبح ہو لینے دو۔ کل جو صبح آئے گی وہ تمام اندھیروں کو نگل جائے گی۔" شیاما بولا۔

سرجو، کلیم اس کی باتیں کچھ سمجھ نہ سکے لیکن رحمو شیاما کی بات سمجھ گیا۔

صبح ہوئی تو شیاما اور رحمو دونوں مکھیا اور گاؤں کے پڑھے لکھے اور بڑے بوڑھوں کے پاس گئے۔ اور ان کو اس بات پر آمادہ کیا کہ سب لوگ شام کو پنچایت بھون میں اکٹھا ہوں۔

سب ہی پنچایت بھون میں جمع ہوئے۔ کئی لالٹینیں جلائی گئیں۔

حقہ بھی گڑ گڑانے لگا۔ گاؤں کے سب سے بوڑھے اور بزرگ رام دیو نے شیاما سے سوال کیا " ہم لوگوں کو تم نے کیوں بلایا ہے؟ بولو۔ یہاں ہندو مسلم سارے لوگ موجود ہیں۔"

شیاما نے کہا۔ " یہ خوشی کی بات ہے کہ یہاں تمام فرقہ کے لوگ اکٹھا ہیں۔ ہم بس یہی چاہتے ہیں کہ آپ تمام لوگ ہمارا وہ گاؤں لوٹا دیں جسے ہم نے چھ ماہ قبل یہاں چھوڑا تھا۔ ہمیں ہمارے گاؤں کی محبت، یہاں کے لوگوں کی بھائی چارگی، بچوں کی کلکاریاں اور ماؤں اور بہنوں کا آپسی میل ملاپ، سد بھاؤنا مجھے واپس کر دیں۔ جو آج ہم سے چھین لیا گیا ہے۔"

رام دیو اور دوسرے لوگوں کی آنکھوں پر بندھی ہوئی پٹیاں جیسے کسی نے نوچ ڈالی ہوں۔ رام دیو اور ظہیر میاں یک زبان بولے۔ " آج تو ایسا ماحول بن گیا ہے کہ ہم ایک دوسرے سے یہ پوچھ بھی نہیں سکتے کہ تم کدھر جا رہے ہو؟ ہندو مسلم ایکتا کا گلا کون گھونٹ رہا ہے۔؟ مذہبی جنون کی یہ ہوا کدھر سے آرہی ہے؟"

ہاں بھئی! ہم تو اس کا پتہ ہی نہیں لگا پائے اب تک۔ بس ایک افواہ کا جنگل ہے جو ہمارے چاروں طرف آگ کی طرح دہک رہا ہے۔" کئی آوازیں ابھریں۔

شیاما کا چہرہ انجانے احساس سے چمک اٹھا۔ امید کی کچھ کرن نظر آئی تو وہ بولا۔

" بھائیو! آپ یہ فیصلہ کریں کہ آپ شانتی سے رہنا چاہتے ہیں

یا نہیں ؟ آپ خوف و ہراس ، ہنگامہ ، قتل و خون کے واتا ورن میں سانس لینا چاہتے ہیں یا امن اور شانتی ، بھائی چارگی ، محبت کے واتا ورن میں سانس لینا چاہتے ہیں ؟

اس سوال نے پنچائت بھون میں بیٹھے لوگوں کو سوچنے پر مجبور کر دیا ۔ شیاما نے بڑا اہم سوال کیا ہے ۔ جو ہماری زندگی سے جڑا ہوا ہے ۔ اگر اس سوال کا جواب ہم نے نہیں ڈھونڈا تو ہم اور ہمارے گاؤں کا خدا حافظ ۔ ابھی لوگ یہ سوچ ہی رہے تھے کہ ایک نوجوان نے جوش میں آکر کہا ۔

" شیاما تو نو مسلمان ہے ۔ تم نے تو مسلمان عورت کا دودھ پیا ہے ۔"

شیاما نوجوان کی اس بات پر خفا نہیں ہوا ، نہ جھنجلایا اور نہ طیش میں آیا ۔ اس نے بہت ہی نرم اور آہستہ لہجے میں بولنا شروع کیا :

" میں نے مسلمان عورت کا دودھ ضرور پیا ہے ۔ لیکن میں نے اپنا مذہب نہیں بدلا ۔ "

اس پر رحمو نے کہا :

" شیاما میرا بھائی ہے ۔ کیوں کہ اس نے میری ماں کا دودھ پیا تھا ۔ لیکن میں نے یا میرے باپ نے اس سے کبھی یہ نہیں کہا کہ تم مسلمان ہو جاؤ ۔ ہمارے مذہب نے یہ کہا ہے کہ دین کے معاملے میں کوئی زور زبردستی نہیں ۔ یعنی کسی کو ایمان لانے پر مجبور نہیں کیا جا سکتا ۔ بھئی ! تمہارے لئے تمہارا دین ہے اور میرے لئے میرا دین ۔"

شیاما نے اس نوجوان سے مخاطب ہو کر کہا :

" اگر تم مجھے ہندو سمجھتے ہو تو جب میں دودھ کی ایک بوند کے لئے رو رہا تھا، تو تمہاری کسی بہن یا کسی ماں نے مجھے چھاتی سے کیوں نہیں لگایا۔؟

یہ تو انسانیت کی ایک پکار تھی جسے رحمو کی ماں صغریٰ نے سُنی اور مجھے اپنا دودھ پلایا۔ مجھے اپنی چھاتی سے لگایا۔ دُنیا کی تمام ماؤں کے دودھ کا رنگ سفید ہوتا ہے۔ اس کا رنگ، ایک دوسرے سے جُدا بھی نہیں کیا جا سکتا۔ دودھ اور لہو کا ایک ہی رنگ ہوتا ہے۔ یہ ہندو مسلمان نہیں ہوتا۔ آج تک بھگوان نے ان کا رنگ نہیں بدلا۔ مذہب کو تو آج رنگ و نسل میں بانٹنے کی سازش کی جا رہی ہے۔ دودھ اور لہو کا رنگ بدلو تو جانیں۔ ہم سب بھائی ہیں دوست۔ ہم میں اور تم میں کوئی فرق نہیں۔"

پنچایت بھون میں جیسے کسی بڑے مُنی رشی کا اوتار ہو گیا ہو کہ سارے لوگوں کے دلوں سے بھید بھاؤ مٹ گئے اور لوگوں نے ایک دوسرے کو گلے سے لگا لیا۔

اور اس طرح شیاما نے دودھ کا قرض چکا دیا۔

●●

"معین شاہد کی کہانیاں زندگی سے جڑی ہوئی کہانیاں، سیدھا سادا دل میں اُتر جانے والا لہجہ، ایسا لہجہ نہیں ہے جو کام کی بات نہیں کر سکتا۔ صرف مرعوب کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ ان کی کہانیوں میں بڑا اندھیرا ہے۔ ان کہانیوں کی دردمندی ان لوگوں کے دل کو چھوئے گی، جو عوام کا دکھ درد جانتے ہیں۔ ان کہانیوں میں روشنی کی پیاس ہے۔ حسرتوں کی حرماں نصیبی ہے۔ ان کہانیوں میں بہار جل رہا ہے۔"

کرشن چندر ۲۹ ستمبر ۱۹۷۴ء

"معین شاہد کے افسانوں میں مطالعے کی حقیقت پسندی، مشاہدے کی گہرائی اور فکر، خلوص ہے۔ ان کا طرز بیان سادہ، رواں اور پُر تاثیر ہے۔ انہوں نے آج کے انسانی سماج کے درد و داغ کو جس طرح محسوس کیا ہے، اپنے قارئین کے سامنے صفائی کے ساتھ پیش کر دیا ہے۔ وہ تعجب ہے کہ ان کہانیوں میں اپنے آس پاس دھڑکتی ہوئی زندگی کے سانسوں کا اُتار چڑھاؤ محسوس ہوتا ہے۔"

(ڈاکٹر) عبدالمغنی

"معین شاہد کے اسلوب میں بہار کے شریف گھرانوں کے لہجہ کی سادگی ہے اور یہی سادہ اسلوب زمین سے ان کا رشتہ جوڑتا ہے۔"

(ڈاکٹر) راہی معصوم رضا ستمبر۔ ۱۹۷۷ء

"معین شاہد کی کہانیاں زندگی کے حقائق کی ترجمان ہوتی ہیں۔ خاص کر متوسط طبقے اور گھرانے کا صحیح نقشہ ان کی کہانیوں میں بدرجۂ اتم موجود ہے۔"

(ڈاکٹر) م۔ ق۔ خان

۲۸ مئی ۱۹۹۳ء

معین شاہد کی مطبوعہ تصانیف

(۱) ٹھوکریں (ناول)

مطبوعہ نسیم بک ڈپو، لکھنؤ ۱۹۵۲ء

(۲) جذبۂ دل (ناول)

مطبوعہ شمع بک ڈپو، نئی دہلی ۱۹۵۶ء

(۳) شیشۂ دل (ناولٹ)

مطبوعہ قمر پاکٹ سیریز الہ آباد ۱۹۶۱ء

(۴) کاجل اور آنسو (افسانے)

مطبوعہ مکتبہ آدرش، گیا ۱۹۷۴ء

(۵) شکستِ آرزو (ناول)

مطبوعہ مکتبہ آدرش، گیا ۱۹۷۷ء

(۶) تیسری آنکھ (افسانے)

مطبوعہ مکتبہ آدرش، گیا ۱۹۸۳ء

(۷) کلام انجم مان پوری (مرتبہ)

مطبوعہ مکتبہ آدرش، گیا ۱۹۷۹ء

(۸) دعائے نیم شبی (افسانے)

مطبوعہ مکتبہ آدرش، گیا ۱۹۹۳ء